ذوالقعدہ ۱۴۳۸ھ
اگست ۲۰۱۷ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

پاکستان کا ماضی، حال اور مستقبل
قرآنی آیات کی روشنی میں

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

داعی رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ و سُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
صفحات: 360، قیمت 475 روپے

حصہ دوم سُورۃ آل عمران تا سُورۃ المائدۃ
صفحات 321، قیمت 425 روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ
صفحات 331، قیمت 425 روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
صفحات 394، قیمت 475 روپے

حصہ پنجم سُورۃ مریم تا سُورۃ السجدۃ
صفحات 480، قیمت 575 روپے

حصہ ششم سُورۃ الاحزاب تا سُورۃ الحجرات
صفحات 484، قیمت 575 روپے

حصہ ہفتم سُورۃ قٓ تا سُورۃ النّاس
صفحات 560، قیمت 650 روپے

(مکمل سیٹ: 3600 روپے)

یکے از مطبوعات: انجمن خُدام القرآن خیبر پختونخوا پشاور
شائع کردہ: مکتبہ خُدام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جلد : 66

شمارہ : 8

ذوالقعدہ 1438ھ

اگست 2017ء

فی شمارہ 30/-

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

اندرون ملک	300 روپے
بھارت وبنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور

فون: 36316638 - 36366638

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5
ملکی سلامتی کا تقاضا
ایوب بیگ مرزا

تذکرہ و تبصرہ — 9
پاکستان کا ماضی، حال اور مستقبل:
قرآنی آیات کی روشنی میں
حافظ عاکف سعید

بیانُ القرآن — 22
سورۃ الروم (آیات ۱ تا ۲۷)
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ثَانِیَ اثْنَیْنِ — 35
مرتبۂ صِدّیقیت اور سیرتِ صدیقیؓ:
آئینۂ قرآن میں
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکیر و موعظت — 56
گناہ کی حقیقت اور توبہ کی اہمیت
پروفیسر عبداللہ شاہین

انوارِ ہدایت — 71
اہلِ ایمان اور رسول اللہ ﷺ سے محبت
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

مردانِ خود آگاہ و خدا مست — 79
شیخ الہندؒ کا احسانی وعرفانی مقام (۲)
محمد ظفر اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ملکی سلامتی کا تقاضا

عالمی سطح پر بچھائی جانے والی بساط اب ایک نقش کی صورت میں دیوار پر اُبھر رہی ہے۔ امریکہ کی جارحانہ پالیسی کا جواب چین نے انتہائی معصومانہ اور غیر جارحانہ انداز میں ''ون روڈ ون بیلٹ'' کے منصوبہ پر کام کے آغاز سے دیا ہے۔ ظاہری طور پر یہ ایک اقتصادی منصوبہ ہے اور یقیناً یہ اقتصادی منصوبہ ہے لیکن امریکہ اور اس کے حلیف یہ سمجھ چکے ہیں کہ اس منصوبے کی کامیابی کے نتائج صرف اقتصادی صورت میں سامنے نہیں آئیں گے' بلکہ یہ ممالک بالآخر سیاسی قربت بلکہ اتحاد اور عسکری قوت میں اضافے اور عسکری و دفاعی اتحاد کی طرف بڑھیں گے۔ یہ سیاسی' عسکری اور دفاعی اتحاد اگر ون روڈ ون بیلٹ منصوبے سے منسلک ہونے والے تمام ممالک کے درمیان نہ ہو سکا تو اس منصوبے میں بہت سرگرمی سے حصہ لینے والے بعض ممالک مثلاً چین' روس' پاکستان اور وسطی ایشیا کے اکثر ممالک تو یقیناً ہر سطح پر ایک دوسرے کے بہت قریب آ جائیں گے اور یہ ڈویلپمنٹ امریکہ کی عالمی شہنشاہیت کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔ یورپ بحیثیت مجموعی امریکہ سے خوش نہیں لیکن بہت سے دوسرے خطرات سے بچنے کے لیے امریکی سرپرستی کو ناگزیر بھی سمجھتا ہے۔ ماضی قریب میں یورپ میں ہونے والے پے در پے واقعات بھی یورپ کو امریکہ سے جڑنے پر مجبور کرتے ہیں۔ بعض مستند اطلاعات کے مطابق دہشت گردی کے ان واقعات میں اسرائیلی ہاتھ ملوث ہے تاکہ یورپ میں امریکی تسلط سے مکمل طور پر آزاد ہونے کا نظریہ پنپ ہی نہ سکے۔ امریکہ اکیسویں صدی میں بھی دنیا پر اپنی برتری قائم و دائم رکھنے کے لیے بھارت' جاپان' جنوبی کوریا اور عرب دنیا کی حمایت سے ایک گروپ تشکیل دے چکا ہے۔ وہ چین کے ون روڈ ون بیلٹ کو ناکامی سے دوچار کرنا چاہتا ہے۔ پاکستان اس چینی منصوبے کا انتہائی اہم پارٹنر ہے' لیکن بدقسمتی سے سیاسی عدم استحکام اور معاشی لحاظ سے تباہی کے کنارے پہ کھڑا یہ ملک کسی بیرونی پریشر کو resist کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ پھر یہ کہ اس پر اسلامی مملکت ہونے کی تہمت بھی ہے۔

حال ہی میں بھارتی وزیراعظم کے دورۂ امریکہ کے دوران جو معاملات باہمی طور پر طے ہوئے ہیں اور اسلحہ کی جو ڈیل ہوئی ہے اس سے واضح طور پر نظر آتا ہے کہ پاکستان اولین ہدف ہے جسے نقصان پہنچانے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔ یہ ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش ہوگی۔ ایک یہ کہ پاکستان کو

غیر مستحکم کرنے یا اسے تباہی سے دوچار کرنے سے سی پیک ہی نہیں ون روڈ ون بیلٹ کا منصوبہ بھی بُری طرح متاثر ہوگا۔ دوسرے یہ کہ پاکستان چونکہ ایٹمی صلاحیت کا حامل ایک اسلامی ملک ہے اور اسرائیل اس سے خطرہ محسوس کرتا ہے لہٰذا اسرائیل کو محفوظ بنانے کے لیے پاکستان کے ایٹمی دانت توڑنے پیش نظر ہیں۔ مودی کے دورۂ امریکہ کے دوران امریکہ اور ٹرمپ نے بھارت کو افغانستان میں مداخلت کی کھلم کھلا دعوت دی ہے۔ ظاہر ہے اس سے پاکستان کے لیے بہت سے مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔ افغانستان میں اشرف غنی کی حکومت بری طرح ناکام ہوئی ہے وہ بھی اپنی ناکامیوں کا ملبہ پاکستان پر ڈال رہا ہے اور افغانستان میں حالات کے بگاڑ کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہراتا ہے۔

پاکستان کی اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ اس کے چین کے سوا کسی ہمسایہ ملک سے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ بھارت اور افغانستان کے علاوہ ایران سعودی عرب باہمی کشمکش نے ہمیں ایران سے دور کر دیا ہے۔ اب ایران بھی ہمارے دشمنوں کی صف میں کھڑا نظر آتا ہے۔ پھر سعودی عرب اور قطر میں جو کشیدگی پیدا ہوئی ہے اور اس میں قریباً سارا عالمِ عرب سعودی عرب کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے' اس نے پاکستان کو شدید مشکلات سے دوچار کر دیا ہے۔ پاکستان غیر جانبدار رہنے کی کوشش کر رہا ہے' لیکن سعودی عرب جو ہمارا پرانا محسن ہے' علاوہ ازیں اُس نے ہمارے حکمرانوں کو خوب نوازا بھی ہے' ہماری غیر جانبداری پر خاصا برہم دکھائی دیتا ہے۔ روس ہمارے قریب آیا ہے لیکن وہ بھارت کو ایک حد سے زیادہ ناراض نہیں کر سکتا' لہٰذا پاکستان روس تعلقات میں ابھی گرم جوشی پیدا نہیں ہوئی۔ چین خطے اور دنیا کا واحد ملک ہے جو اعلانیہ طور پر ہماری پشت پر کھڑا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا چین پاکستان کی خاطر دنیا سے ٹکر لینا afford کر سکتا ہے؟ خاص طور پر اس حالت میں کہ اندرونِ ملک سیاست دان بری طرح گتھم گتھا ہیں' معاشی لحاظ سے پاکستان دیوالیہ ہونے کے قریب ہے اور ادارے ریاست سے زیادہ افراد سے اپنی وفاداری کا اظہار کرتے ہیں۔ معاشرہ کرپشن اور دوسری اخلاقی برائیوں کی وجہ سے گل سڑ گیا ہے۔ ہر شخص دوسروں کی برائیوں پر نگاہ رکھتا ہے' اسی کی بات کرتا ہے' لیکن خود کو مستثنیٰ سمجھتا ہے۔ دوسروں کی اصلاح چاہتا ہے لیکن اپنے گریبان میں منہ ڈالنے کو تیار نہیں۔

ایک بار پھر خارجی خطرات کی طرف لوٹتے ہوئے ہم قارئین کو آگاہ کرنا چاہیں گے کہ امریکہ' بھارت اور اسرائیل پر مشتمل جو تثلیث وجود میں آئی ہے ان کی پاکستان دشمنی کی اپنی اپنی وجوہات بھی ہیں۔ مثلاً امریکہ سمجھتا ہے' اور کسی حد تک صحیح سمجھتا ہے' کہ افغانستان میں اس کی ناکامی کا باعث پاکستان ہے' اس ناکامی نے اس کی عالمی حیثیت کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ حال ہی میں اس کا واضح ثبوت ملا ہے جب امریکہ کی سینیٹ کی کمیٹی برائے آرمڈ فورسز کے چیئرمین سینیٹر جان مکین نے ایک پانچ رکنی وفد کی قیادت کرتے ہوئے پاکستان کا دورہ کیا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ

چیئرمین سینیٹ کمیٹی برائے آرمڈ فورسز کا عہدہ ہر امریکی حکومت کے لیے انتہائی اہم ہوتا ہے اور جان مکین تو ذاتی حیثیت میں بھی ایک انتہائی اہم شخصیت ہے۔ انہیں بلاخوفِ تردید وائٹ ہاؤس اور پینٹا گون کا ترجمان کہا جا سکتا ہے۔ جان مکین نے اپنے دورہ کے دوران پاکستان کی عسکری قیادت سے طویل ملاقاتیں کیں۔ بعد ازاں کشمیر کے حوالے سے پاکستانیوں کو یہ طفل تسلی دی کہ امریکہ نے کشمیر کے حوالے سے اپنی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کی‘ لیکن جونہی موصوف افغانستان پہنچے تو ان کا لہجہ انتہائی تلخ ہو گیا اور پاکستان کو دھمکی دی کہ وہ اپنا رویہ بدلے وگرنہ ہم اپنا رویہ بدل لیں گے۔ ہماری رائے میں یہ انتہائی سنگین دھمکی ہے۔ پاکستان کے اربابِ اقتدار اس دھمکی کو سنجیدگی سے لیں۔ علاوہ ازیں چین کا محاصرہ امریکہ کی موجودہ خارجہ پالیسی میں بنیادی حیثیت اور اہمیت رکھتا ہے۔ اس محاصرے کی تکمیل بھی پاک چین دوستی کی وجہ سے نہیں ہو پا رہی۔ اس لیے کہ پاکستان نہ صرف چین کا ہمسایہ ہے‘ بلکہ اس کی جغرافیائی لوکیشن ایسی ہے کہ چین کے محاصرے کے لیے پاکستان کا تعاون ناگزیر ہے۔ اسرائیل کا مسئلہ‘ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے‘ ایک اسلامی ملک کی ایٹمی صلاحیت ہے۔ رہا بھارت تو وہ پاکستان کے وجود کو ہی ناجائز سمجھتا ہے کہ یہ ملک (پاکستان) بھارت ماتا کے ٹکڑے کر کے بنایا گیا ہے۔ بھارت جو کسی صورت کشمیریوں کی جدوجہد آزادی سے نمٹ نہیں پا رہا‘ سمجھتا ہے کہ اگر پاکستان کو تہس نہس کر دیا جائے تو کشمیر ہی نہیں بھارت میں آزادی کی تمام تحریکیں دم توڑ جائیں گی۔

پاکستان دشمنی میں گویا امریکہ بھارت اسرائیل گٹھ جوڑ فطری ہے۔ اس فطری گٹھ جوڑ کو ناکام و نامراد کرنے کے لیے پاکستان کو ناقابل تسخیر بنانا ہوگا‘ لیکن بیان کردہ پس منظر اور موجودہ حالت میں یہ انتہائی مشکل نظر آتا ہے۔ البتہ ہم مایوس نہیں‘ اور ہماری اُمید کی وجہ محض جذباتی اور بعض عقائد کی بنیاد پر نہیں‘ بلکہ بعض ٹھوس بنیادوں اور عقلی دلائل پر بھی ہے۔ سرفہرست بات یہ ہے کہ پاکستان کی جغرافیائی لوکیشن روس اور چین جیسی امریکہ دشمن قوتوں کے لیے بھی انتہائی اہم ہے۔ موجودہ صورتحال میں وہ پاکستان کا کوئی بڑا نقصان نہیں چاہیں گے۔ خود امریکہ کو یہ خطرہ ہے کہ پاکستان کی تباہی اور چین کے محاصرے کی صورت میں خطے میں بھارت ایک ایسی قوت بن سکتا ہے جو بعد ازاں خطے میں امریکی وجود کے لیے خطرناک ثابت ہو۔ بھارت اپنے مفاد میں یہ یوٹرن لے سکتا ہے۔ ثانیاً یہ کہ پاکستان بہرحال ایک ایٹمی قوت ہے۔ وہ امریکہ کا خواہ کچھ نہ بگاڑ سکے لیکن جب اس کی سلامتی خطرے میں پڑے تو وہ بھارت اور اسرائیل کا بھی صفایا کر سکتا ہے۔ تیسری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ پاکستان قریباً بائیس کروڑ انسانوں کا ملک ہے۔ شرح آبادی کے تناسب سے یہاں جوانوں کی تعداد دنیا بھر میں سرفہرست ہے۔ یہ پاکستان کا بہت بڑا اور قابل قدر سرمایہ ہے۔ اگرچہ آج معاشرے کا بحیثیتِ مجموعی رجحان منفی بلکہ انتہائی منفی ہے۔ حکمرانوں سے عوام نے یہ سیکھا ہے کہ ذاتی مفاد دوسرے تمام مفادات‘ چاہے وہ قومی ہوں یا ملی‘ پر ترجیح رکھتا ہے۔ آج ہم ملک کی اس شاخ کو

کاٹ رہے ہیں جس پر ہمارا گھونسلہ ہے‘ آج ہم تباہی کی طرف سرپٹ بھاگ رہے ہیں‘ لیکن اس حقیقت سے بھی کوئی اندھا اور بہرہ ہی انکار کر سکتا ہے کہ اس قوم میں بڑا ٹیلنٹ ہے، بڑی خداداد صلاحیت ہے۔ دور کیوں جاتے ہیں‘ پاکستان کی کرکٹ ٹیم جو رینگتی گھسٹتی عالمی چیمپئن ٹرافی کا حصہ بنی اس نے کرکٹ کی دنیا میں turn tables کر کے ایک دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

کیا یہ صلاحیتیں پاکستان کی کرکٹ ٹیم تک محدود ہیں؟ کیا وہ پاکستان جو سائنس اور ٹیکنالوجی میں پسماندہ ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے اس نے جدید ترین طریقہ سے ایٹمی صلاحیت حاصل نہیں کی؟ پھر tactical weapons بنا کر دو ممالک کے سوا دنیا بھر کو پیچھے نہیں چھوڑ گیا؟ کیا غیر عربی ہوتے ہوئے پاکستان نے ایسے ایسے مفسرِ قرآن‘ شیخ الحدیث اور علماء کرام پیدا نہیں کیے کہ عربی بھی منہ اٹھا کر دیکھتے ہیں؟ کیا سہولتوں کے فقدان اور وسائل نہ ہونے کے باوجود پاکستان کے بعض نوجوانوں نے آئی ٹی کے میدان میں ایک دنیا کو مات نہیں دی؟ کیا ہمارے ڈاکٹروں نے دنیا کے ہسپتالوں میں محیر العقول کارنامے سرانجام نہیں دیے؟ امریکہ نے ہمیں ایسے F16 دیے تھے جن پر nuclear warhead نہ لگ سکے۔ ہمارے انجینئروں نے یہ کارنامہ بھی کر دکھایا۔

مایوسی کفر ہے۔ اس انتہائی باصلاحیت قوم کا رخ بدلنے کی ضرورت ہے‘ اس کی فکر اور سوچ بدلنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام اگر کوئی منظم گروہ‘ جماعت یا تنظیم کرے گی تو اسے بہت سے مراحل سے گزر کر ایک حقیقی انقلاب برپا کرنا ہوگا۔ اس انقلاب کے لیے اسلامی جماعت کے کارکنوں کو بے مثل صبر و برداشت کا مظاہرہ کرنا ہوگا‘ اور اگر باطل نظام کے رکھوالے بدترین ظلم و تشدد پر اتر آئیں تو مال و جان کی قربانی بھی دینا ہوگی۔ یہ انقلاب لوگوں کی وہ ترجیحات الٹ دے گا جو انہوں نے آج قائم کر رکھی ہیں‘ اور وہ لوگ جو آج منفی رجحانات اور پست سوچ رکھتے ہیں اور ہر سطح پر بُری طرح پسپائی اختیار کر رہے ہیں وہی لوگ مثبت رجحانات اور اعلیٰ فکر کے ساتھ دوسروں کو خود پر ترجیح دیتے ہوئے اس سے کہیں زیادہ تیزی سے فوز و فلاح کی طرف لپکیں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر آج پاکستان کو مخلص قیادت دستیاب ہو جائے‘ ایسی قیادت جو اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر سوچے اور جو کہے اس پر عمل کرے تو اگرچہ ایسی قیادت کا موجودہ معاشرے سے اُبھر کر آ جانا آسان نظر نہیں آتا لیکن خدا چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا؟ اس سے سافٹ انقلاب بھی رونما ہو جائے گا۔ سارا منظر بدل جائے تو ایسی صورت میں بے شمار صلاحیتوں سے لیس یہ قوم دنیا بھر کی قوتوں کو شکست سے دوچار کر سکتی ہے۔ ہم اللہ ربّ العزت سے دعا کرتے ہیں کہ اس قوم کا دل بدل دے‘ اس کی سوچ‘ فکر اور طرزِ عمل بدل دے۔ اس کی سوچ یہ ہو جائے کہ اللہ کی رضا کیا ہے اور طرزِ عمل یہ ہو جائے کہ سُنّتِ رسول ﷺ کیا ہے۔ یہی ہماری ملکی سلامتی کا تقاضا اور ہماری اخروی نجات کی راہ ہے۔ اللہ ہمیں اس تقاضا کو اپنا دینی فریضہ سمجھ کر پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین! ❁❁❁

پاکستان کا ماضی‘ حال اور مستقبل
قرآنی آیات کی روشنی میں

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

> امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ نے ۱۲/اگست ۲۰۱۶ء کو مسجد جامع القرآن‘ قرآن اکیڈمی‘ لاہور میں یومِ آزادی کے حوالے سے خصوصی خطاب فرمایا‘ جس کی تلخیص ماہنامہ میثاق کے ستمبر ۲۰۱۶ء کے شمارہ میں بطور اداریہ شائع کی گئی۔ بعض رفقاء واحباب کے اصرار پر اگست ۲۰۱۷ء کے شمارے میں مکمل خطاب ہدیۂ قارئین ہے۔ (ادارہ)

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم — بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْهِ ذِکْرُکُمْ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰﴾ (الانبیاء)

﴿وَاذْکُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ یَّتَخَطَّفَکُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىکُمْ وَاَیَّدَکُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۝۲۶ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِکُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۷﴾ (الانفال)

﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْیَةً کَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً یَّاْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ فَکَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ ۝۱۱۲﴾ (النحل)

معزز سامعین کرام!

۱۴/اگست کو ہمارے ہاں یوم آزادی بڑے جوش وجذبے سے منایا جاتا ہے اور بلاشبہ قومی اعتبار سے اس سے بڑا دن کوئی ہو ہی نہیں سکتا‘ اس لیے کہ اس دن قوم کو آزادی ملی تھی اور مملکتِ خداداد پاکستان وجود میں آیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمیں چاہیے تھا کہ ہم ۲۷ رمضان المبارک کو اپنا یومِ آزادی قرار دیتے‘ اس لیے کہ وہ مبارک شب تھی‘ مبارک دن تھا اور مبارک مہینہ تھا جس میں اللہ ربّ العزت نے ہمیں پاکستان جیسے ملک کا تحفہ عطا کیا تھا‘ لیکن ہم نے پہلے دن سے ہی اس کو اور رنگ دے دیا۔ بجائے ۲۷ رمضان کے ۱۴/اگست کو یوم آزادی قرار دے دیا‘ جس کے نتیجے میں اسلام کے ساتھ ہمارا تعلق کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔ اسی طرح ہم نے تاریخ سے بھی اپنا ناطہ توڑ کر گمراہیوں کو آواز دی اور آج انہی گمراہیوں کا نتیجہ ہے کہ ہم اپنے ماضی اور اپنی اصل بنیاد سے کٹ چکے ہیں۔ نتیجتاً ہمارا مستقبل بھی اندھیروں کی نذر ہوتا نظر آ رہا ہے۔

قرآنِ مجید اور اقوامِ عالَم کے حالات وواقعات

توجہ طلب بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں قوموں کے حالات وواقعات اتنی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں کہ ہر قوم کو اپنا چہرہ قرآن مجید میں نظر آ سکتا ہے۔ اس ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ہے جو عظمتِ قرآن کے حوالے سے جوامع الکلم کا عظیم شاہکار ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ’’عنقریب تم فتنے دیکھو گے‘‘۔ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ان فتنوں سے بچنے کا راستہ کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((کِتَابُ اللّٰهِ، کِتَابُ اللّٰهِ فِیهِ نَبَأُ مَا قَبْلَکُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَکُمْ وَحُکْمُ مَا بَیْنَکُمْ، هُوَ الْفَصْلُ لَیْسَ بِالْهَزْلِ، هُوَ الَّذِی مَنْ تَرَکَهُ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ، وَمَنِ ابْتَغَی الْهُدٰی فِی غَیْرِهٖ أَضَلَّهُ اللّٰهُ، فَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِینُ، وَهُوَ الذِّکْرُ الْحَکِیمُ، وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیمُ، وَهُوَ الَّذِی لَا تَزِیغُ بِهِ الْأَهْوَاءُ، وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْأَلْسِنَةُ، وَلَا یَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ، وَلَا یَخْلَقُ عَنْ کَثْرَةِ الرَّدِّ، وَلَا تَنْقَضِی عَجَائِبُهُ، وَهُوَ الَّذِی لَمْ یَنْتَهِ الْجِنُّ إِذْ سَمِعَتْهُ أَنْ قَالُوا ﴿اِنَّا

سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا﴾ (الجن:۱) هُوَ الَّذِی مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ، وَمَنْ حَکَمَ بِهٖ عَدَلَ، وَمَنْ عَمِلَ بِهٖ اُجِرَ، وَمَنْ دَعَا اِلَیْهِ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ))(۱)

''(ان فتنوں سے بچنے کا ذریعہ ہے:) اللہ کی کتاب — اللہ کی کتاب میں تم سے پہلے لوگوں کی خبریں بھی ہیں اور بعد میں آنے والوں کی بھی' اور یہ تمہارے درمیان فیصلہ کرنے والی ہے۔ یہ الگ کرنے والی چیز ہے' اس میں کسی قسم کا کوئی مذاق نہیں ہے۔ جو ظالم شخص اسے ترک کردے گا اللہ اسے برباد کردے گا' اور جو شخص اس کے بجائے کسی اور جگہ سے علم حاصل کرنا چاہے گا اللہ اسے گمراہی کا شکار کردے گا۔ پس یہ اللہ کی مضبوط رسّی ہے۔ یہ حکمت کی نصیحت کرنے والا اور یہی سیدھا راستہ دکھانے والا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے خواہشات گمراہی کا شکار نہیں ہوتیں اور زبانیں غلطی سے محفوظ رہتی ہیں۔ علماء اس کی وجہ سے سیر نہیں ہوتے اور بکثرت استعمال سے یہ پرانا نہیں ہوتا' اور اس کے عجائب ختم نہیں ہوتے۔ یہ وہ ہے کہ اسے جنات نے سنا تو یہ کہنے سے باز نہ رہ سکے: ''بے شک ہم نے قرآن کو سنا ہے جو بڑی حیرت انگیز چیز ہے''۔ یہ وہ ہے جو اس کے ہمراہ بات کرے گا وہ سچ بولے گا اور جو اس کے مطابق فیصلہ کرے گا وہ عدل سے کام لے گا اور جو اس پر عمل کرے گا اسے اجر ملے گا' اور جو اس کی طرف دعوت دے گا وہ تو سیدھے راستے کی طرف راہنمائی پا گیا۔''

اس حدیث کے ابتدائی جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی کتاب میں ہر قوم اپنا چہرہ دیکھ سکتی ہے اور اس کتاب میں ہر قوم کے مسائل کا حل موجود ہے۔ اسی بات کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی کئی مقامات پر کیا گیا ہے' مثلاً سورۃ الانبیاء میں فرمایا:

﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْهِ ذِکْرُکُمْ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰﴾﴾

''(اے لوگو!) اب ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب نازل کر دی ہے' اس میں تمہارا ذکر موجود ہے۔ تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟''

تاریخِ پاکستان: سورۃ الانفال' آیت ۲۶ کی روشنی میں

مفسرین نے سورۃ الانبیاء کی مذکورہ بالا آیت کی مخاطب' نزولِ قرآن سے لے کر تا قیامِ قیامت کی تمام اقوامِ عالم کو قرار دیا ہے۔ اس تناظر میں بحیثیت قوم اگر ہم اپنا جائزہ لیں تو سورۃ

(۱) سنن الدارمی' کتاب فضائل القرآن' باب فضل من قرأ القرآن۔

الانفال کی آیت ۲۶ میں پوری تاریخ پاکستان سمٹ کر سامنے آجاتی ہے۔ ماضی کی گمراہیوں کی نشاندہی' عذابوں اور گردابوں میں پھنسے حال اور اندھیروں میں ڈوبتے مستقبل کا احوال اسی آیت میں موجود نظر آتا ہے۔ آج ہم اسی آیت کے تناظر میں پاکستان کے ماضی' حال اور مستقبل کا جائزہ لیں گے۔ آیت کے ابتدا میں فرمایا:

﴿وَاذْکُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ﴾

''اور یاد کرو جبکہ تم تھوڑی تعداد میں تھے اور زمین میں دبا لیے گئے تھے''

اس آیت میں اصل تذکرہ تو ان مسلمانوں کا ہے جو مشرکین مکہ کے مظالم سہہ رہے تھے' لیکن ظاہر ہے اشارہ ہماری طرف بھی ہے —— مکہ مکرمہ میں اس بات کا اقرار کرنا کہ: ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں'' اپنے آپ کو مصائب اور مشکلات میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ علامہ اقبال نے کہا تھا: ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

اور ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

یہی وجہ ہے کہ مکہ میں جو کلمہ پڑھتا تھا' اس کو طرح طرح سے ستایا جاتا تھا اور ذہنی وجسمانی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ ان مصائب ومشکلات کی بنا پر حضور نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی سخت محنت اور جانفشانی کے باوجود مکہ میں مسلمانوں کی کل تعداد دو سو تھی جبکہ ان کے مقابلے میں مشرکین ہزاروں میں تھے اور انہوں نے ایمان لانے والے نومسلموں کا ہر طرح سے گھیراؤ کیا ہوا تھا۔

تاریخ پاکستان پر نظر دوڑائیں تو قیامِ پاکستان سے قبل مسلمانانِ برصغیر کی بعینہٖ وہی حالت تھی جو مکہ کے مسلمانوں کی تھی۔ برصغیر پر مسلمانوں نے اگرچہ ساڑھے آٹھ سو سال تک حکمرانی کی لیکن انگریزوں کی غلامی میں آ کر وہ بدترین اقلیت میں بدل گئے تھے۔ چونکہ انگریزوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی مسلمان ڈٹ

کرانگریز کے قبضہ کے خلاف لڑے تھے‘ اس لیے انگریزوں نے اس کا بدترین انتقام مسلمانوں سے لیا اور انہیں ہر شعبۂ زندگی میں پسماندہ تر کر دیا۔ جبکہ divide and rule فارمولے کے تحت انگریزوں نے ہندوؤں کو اُٹھایا‘ انہیں مسلمانوں کے خلاف کھڑا کیا اور سیاست‘ تجارت‘ معاش اور معاشرت سمیت ہر شعبۂ زندگی میں ان کو مسلمانوں پر ترجیح دی گئی۔ چنانچہ انگریزوں کی اس پشت پناہی کے باعث ہندو نہ صرف جاگ اُٹھے بلکہ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ بھی بھڑک اُٹھی۔ وہ تعداد میں بھی کئی گنا زیادہ تھے‘ انہیں انگریزوں کی بھی مکمل سپورٹ حاصل تھی اور اب وہ ہر میدان میں مسلمانوں سے آگے بھی تھے۔ جبکہ مسلمان اب دوہری غلامی میں پس رہے تھے‘ ایک طرف انگریزوں کی اور ایک طرف ہندوؤں کی۔

ایسے حالات میں انسان کو ہمیشہ اسی بات کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اس کا وجود ہی ختم نہ ہو جائے اور اس کا نام ونشان ہی نہ مٹ جائے۔ اسی کا تذکرہ آیت مذکورہ کے اگلے جملہ میں ہو رہا ہے۔ فرمایا:

﴿تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ﴾

”تمہیں اندیشہ تھا کہ لوگ تمہیں اُچک لے جائیں گے“

مشرکین کے بے انتہا ظلم وستم کے باعث کئی صحابہ کرام ؓ شہید بھی ہو گئے تھے اور باقی اہلِ ایمان کو بھی ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں ان کا وجود مٹا نہ دیا جائے۔ اسی طرح اگرچہ برطانیہ اپنی بساط لپیٹ رہا تھا لیکن جاتے جاتے ہندو اکثریت کی صورت میں مسلمانوں پر ایک غاصب‘ ظالم و جابر قوت مستقل طور پر مسلط کرنے کا خواہاں تھا اور یہ وہ قوت تھی جس نے اپنی بھیانک تاریخ میں ہزاروں قوموں کو اپنے ابلیسی ہتھکنڈوں کے باعث اس طور پر نگل لیا تھا کہ تاریخ میں ان کا نام ونشان تک نہ رہا تھا۔ چنانچہ ہندو اکثریت کے غلبہ کی صورت میں یہ قوت اب مسلمانانِ برصغیر کو بھی ہڑپ کرنا چاہتی تھی اور بحیثیتِ قوم مسلمانوں کا نام ونشان تک مٹانے کے درپے تھی۔

مزید یہ کہ انگریزوں نے تاریخ کے نام پر ہندوؤں کو باور کرا دیا تھا کہ باہر سے تھوڑے ہی مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے تھے‘ جبکہ باقی سب ہندو نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

چنانچہ ہندوؤں نے ان کو دوبارہ ہندومت میں ضم کرنے کے لیے شدھی اور سنگھٹن تحریکیں پورے ہندوستان میں زور شور کے ساتھ جاری کی ہوئی تھیں جن کے تحت مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنانا مقصود تھا۔ چونکہ اب وہ ہر شعبۂ زندگی میں مضبوط ہو گئے تھے اور انہیں انگریز کی پشت پناہی بھی حاصل تھی لہٰذا انہیں بڑی کامیابیاں مل رہی تھیں۔ ہندوستان کے کئی علاقوں میں مسلمان ان تحریکوں کا لقمہ بن کر یا تو جانوں سے ہاتھ دھو رہے تھے یا پھر ارتداد کے مرتکب ہو رہے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد الیاس ؒ کو اٹھایا اور انہوں نے ہندوؤں کی اس سازش کے آگے روک لگائی۔ انہوں نے دیکھا کہ میوات کے علاقے میں مسلمانوں کی کثیر تعداد مرتد ہو کر دوبارہ ہندومت کی طرف جا رہی ہے —— اس لیے کہ وہاں علم دین کی بڑی کمی تھی اور ہندو رسوم ورواج کا اس قدر غلبہ تھا کہ مسلمان مولوی سے نکاح پڑھوانے کے باوجود ہندو رواج کے مطابق پھیرے بھی لیتے تھے اور شادی کی ساری ہندوانہ رسمیں بھی ادا کرتے تھے —— مولانا الیاسؒ نے میوات سے مزدوری کی غرض سے آنے والے مزدوروں کو دیہاڑی کے حساب سے اُجرت دے کر دین سکھانے کا آغاز کیا۔ وہ انہیں اپنے مدرسے میں لے جاتے تھے اور وہاں انہیں دین کی بنیادی باتیں سکھاتے تھے۔ مولانا کی کاوشوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ یہ مزدور واپس میوات جا کر لوگوں کو دین سکھانے لگے اور دیکھتے دیکھتے ایک تحریک شروع ہوئی اور ہندوؤں کو ناکام ہونا پڑا۔ لیکن اس کے باوجود کئی علاقوں میں مسلمان ہندو تحریکوں کا شکار ہوئے۔ جو باقی بچے تھے انہیں بھی ووٹ کی بنیاد پر اپنی حیثیت مٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور پورے برصغیر میں مسلمانوں کو خدشہ لاحق تھا کہ وہ اقلیت بن کر ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے۔

مسلمانانِ برصغیر کے لیے اللہ کی نصرت

آیت کے اگلے حصہ میں اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت کا تذکرہ ہے‘ فرمایا:

﴿فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ﴾

”تو اللہ نے تمہیں پناہ کی جگہ دے دی اور تمہاری مدد کی اپنی خاص نصرت سے“

عام حالات میں ایسا ممکن نہیں تھا کہ اتنے سخت حالات اور کم تعداد کے باوجود کوئی جماعت غلبہ حاصل کر لے‘ لیکن اللہ کے دین کی مدد کرنے والوں کے لیے یہ اللہ تعالیٰ کی خاص تدبیر تھی کہ

تین سال کے اندر اندر مدینہ طیبہ کے دو بڑے قبائل اوس اور خزرج مسلمان ہو گئے‘ ان کی آپس میں سینکڑوں سالہ پرانی دشمنی بھی ختم ہو گئی اور وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر اسلام اور مؤمنین کے مددگار بن گئے۔ اس طرح مکہ کے ان مسلمانوں کو یثرب میں ایک محفوظ ٹھکانہ مل گیا جنہیں اپنی قلیل تعداد کے باعث خدشہ تھا کہ ان کا وجود تک مٹا دیا جائے گا۔

اسی طرح بظاہر کوئی اُمید نہیں تھی کہ مسلمان برصغیر میں دوبارہ سر اُٹھا سکیں گے۔ خدشہ تھا کہ اگر انگریز کی غلامی سے نکل بھی گئے تو ہندو اکثریت کی تلوار ان کے سروں پر ہمیشہ لٹکتی رہے گی۔ کانگریس ہندو اکثریت کی نمائندہ جماعت تھی جس میں وقت کے نامور اور بڑے بڑے مسلم قائدین بھی شامل تھے۔ دوسری طرف مسلم لیگ صرف نوابوں کا ایک ٹولہ تھا اور جماعت احرار‘ خاکسار گروپ اور علمائے ہند کی ایک بڑی تعداد مسلم لیگ سے الگ تھی۔ ہندو نہ صرف تقسیم برصغیر کے خلاف تھے بلکہ وہ مسلمانوں کو بحیثیت علیحدہ قوم تسلیم کرنے سے ہی انکاری تھے۔ انگریز سرکار بھی ظاہری و باطنی طور پر ہندو اکثریت کے ساتھ تھی۔ ان حالات میں ممکن ہی نہیں تھا کہ پاکستان بن جاتا‘ مگر جب ’’پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ!‘‘ کے نعرے برصغیر کی فضاؤں میں گونجنا شروع ہوئے تو مسلم لیگ کو ایک نئی قوت میسر آئی۔ قائداعظم جو حالات سے مایوس ہو کر واپس لندن جا چکے تھے‘ علامہ اقبال کی سفارش پر واپس آئے اور انہوں نے مسلمانوں کی قیادت سنبھال لی اور بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو رمضان المبارک کی ستائیسویں شب (جس کے بارے میں غالب امکان ہے کہ وہ شب قدر تھی اور یہی وہ مبارک رات تھی جس میں قرآن نازل ہوا تھا) کو پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ ایسا صرف اور صرف اللہ عزوجل کی مدد اور تائید سے ممکن ہوا تھا۔

پاکستان کا مقصد: نظامِ خلافت راشدہ کا نفاذ

اس حوالے سے خود قائداعظم کی بھی یہ گواہی ریکارڈ پر موجود ہے کہ قیامِ پاکستان اللہ تعالیٰ کی تائید غیبی سے ہی ممکن ہوا اور یہ کہ خلافت راشدہ کا نظام ہی پاکستان کی منزل ہے۔ قائداعظم کے بالکل آخری دور میں جب وہ بستر مرگ پر تھے اور ٹی بی کے علاوہ دوسرے عوارض بھی انہیں لاحق ہو چکے تھے تو ان کی دیکھ بھال کے لیے ڈاکٹروں کی پوری ٹیم ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس ٹیم میں ڈاکٹر ریاض علی شاہ بھی شامل تھے۔ انہوں نے اپنی یادداشتوں

(جنہیں بعض اخبارات نے بھی شائع کیا تھا) میں لکھا ہے کہ ایک روز ہم نے محسوس کیا کہ قائداعظم کچھ کہنا چاہ رہے ہیں۔ ٹی بی کے اثرات اتنے گہرے ہو چکے تھے کہ بات بھی کرتے تھے تو ہانپ جاتے تھے اور یہ صورتحال ان کے لیے بڑی خطرناک ہو سکتی تھی‘ اس لیے ہم نے انہیں بات کرنے سے منع کیا ہوا تھا۔ ڈاکٹرز نے مشورہ کیا کہ قائداعظم جو کہنا چاہتے ہیں‘ اس کا موقع انہیں دینا چاہیے ورنہ اس کا بھی منفی اثر پڑے گا۔ لہٰذا سب نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ پہلی بات انہوں نے یہ کی کہ جب مجھے احساس ہوتا ہے کہ پاکستان بن گیا تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے اور میری روح کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ یہ اللہ کی تائید اور رسولِ خدا ﷺ کے فیضان کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔ اگلے الفاظ پاکستان کے اصل مستقبل کے حوالے سے بہت زیادہ اہم ہیں‘ جو یہ تھے کہ ’’اب مسلمانانِ پاکستان کی ذمہ داری ہے کہ یہاں پر خلافت راشدہ کا نظام قائم کریں۔‘‘

قائداعظم نے خاص طور پر ’’خلافت راشدہ‘‘ کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے برصغیر میں اگرچہ مسلمانوں کی حکومت تھی‘ لیکن وہ اسلام کے حوالے سے کوئی آئیڈیل حکومت نہ تھی۔ اس میں عوامی سطح پر شرعی قوانین نافذ تھے‘ شرعی عدالتیں تھیں‘ قاضی اور مفتی موجود تھے‘ لیکن اوپر کی سطح پر نظام ملوکیت تھا جو یقیناً آئیڈیل اسلامی نظام نہیں ہے۔ اسی لیے قائداعظم نے خاص طور پر خلافت راشدہ کے نظام کو رائج کرنے کی بات کی کہ اسلام کے نام پر وجود میں آنے والے اس ملک میں رسول اللہ ﷺ کے عطا کردہ نظام کا نمونہ ہمارے پاس خلافت راشدہ کی صورت میں موجود ہے تو اسی نظام کے طرز پر پاکستان میں بھی اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی نافذ ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت کی ایک واضح نشانی یہ تھی کہ مکہ سے خالی ہاتھ ہجرت کر کے مدینہ آنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے باغات کا مالک بنا دیا۔ اسی طرح بھارت سے سب کچھ لٹا کر آنے والے مسلمانوں کو بھی اللہ نے یہاں پاکیزہ رزق عطا کیا اور دنیا جہان کی نعمتیں اس خطہ میں پیدا فرمائیں۔ آیت کے اگلے جملہ میں اسی کا تذکرہ کیا گیا ہے‘ فرمایا:

﴿وَرَزَقَكُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ﴾ ’’اور تمہیں بہترین پاکیزہ رزق عطا کیا‘‘

مسلمان اگرچہ مکّہ سے ہجرت کر کے خالی ہاتھ آئے تھے‘ مگر اللہ ربّ العزت نے اپنے فضل و

احسان سے انہیں بہترین رزق کے ذرائع عطا کیے۔ انہیں یثرب کے باغوں کا مالک بنا دیا اور ان کے گھر پہلے سے بھی بہتر انداز میں آباد ہو گئے۔ اسی طرح برصغیر کے مسلمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے پاکستان کی صورت میں ایسا آزاد خطہ عطا فرمایا جس میں وہ تمام نعمتیں موجود ہیں جو شاید ہی دنیا کے کسی ملک کو مکمل میسر ہوں۔ چاروں موسم‘ زرخیز زمینیں‘ وافر دریائی پانی‘ معدنیات وغیرہ۔

قیامِ پاکستان اور شکرِ الٰہی کے تقاضے

ایسی خاص نعمتیں جب کسی قوم کو عطا کی جاتی ہیں تو اصل میں یہ ان کے لیے سخت آزمائش بھی ہوتی ہے اور دیکھنا یہ مقصود ہوتا ہے کہ وہ ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں یا ناشکری کی روش پر چل نکلتے ہیں۔ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۲۶﴾ ’’تاکہ تم شکر ادا کرو۔‘‘

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی راہنمائی میں مسلمانوں نے شکر گزاری کا حق اللہ کے دین کے غلبے کے لیے اپنا تن مَن دھن لگا کر ادا کیا اور اس کے نتیجے میں اللہ نے بھی اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے انہیں دنیا میں غالب کر دیا۔ دنیا نے دیکھا کہ وہ بوریا نشین مسلمان جو خالی ہاتھ تھے اور جنہیں ہر وقت اپنے وجود کے خاتمے کا دھڑکا لگا رہتا تھا اب قیصر وکسریٰ کی سلطنتوں کے مالک بن گئے تھے اور دنیا کی سپر طاقتوں پر ان کا لرزہ طاری تھا۔

دوسری طرف پاکستانی قوم پر شکر گزاری کا تقاضا تھا کہ وہ اللہ سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کرتی۔ لا الٰہ الا اللہ کی بنیاد پر اللہ کی حاکمیت مانی جاتی اور محمد رسول اللہ ﷺ کا نظام قائم کیا جاتا۔ ویسے بھی مسلمان کسی علاقے میں ہوں اور وہاں اللہ کا دین نافذ نہ کریں تو باغی ہیں‘ اور جس قوم پر اللہ نے اتنا بڑا احسان کیا ہو اُس پر تو لازم تھا کہ شکر گزاری کے طور پر اپنا وعدہ پورا کرتی۔ چنانچہ سورۃ الانفال کی اگلی آیت میں اسی بات کی تلقین نظر آتی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۷﴾

’’اے اہلِ ایمان! مت خیانت کرو اللہ سے اور رسول (ﷺ) سے اور نہ ہی اپنی (آپس کی) امانتوں میں خیانت کرو جانتے بوجھتے۔‘‘

لیکن نظامِ مصطفیٰ سے منہ موڑ کر ہم اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ بھی خیانت کے مرتکب ہوئے

اور قومی امانتوں میں بھی جی بھر کر خیانت کی۔ حالانکہ قائداعظم نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد علامہ اسد کو Institute of Reconstruction of Islamic System کے نام سے ایک ادارہ بنانے پر مامور کیا تھا جس کے تحت پورے سسٹم کو اسلامائز کرنا مقصود تھا۔ علامہ اسد نے سب سے پہلے نظامِ تعلیم پر کام شروع کیا اور مشورہ دیا کہ جب تک اسلامی نظامِ تعلیم نہیں بن جاتا‘ سکولوں اور کالجوں کو بند کر دیا جائے‘ کیونکہ یہ انگریزی نظامِ تعلیم نئی نسل کو برباد کر دے گا۔ بہرحال علامہ اسد نے کام جاری رکھا‘ لیکن قائداعظم کی وفات کے بعد بیوروکریسی نے خیانت (کرپشن) کا آغاز سب سے پہلے اسی اہم ادارے سے کیا جس کے ذمہ پورے سسٹم کو اسلامائز کرنا تھا۔ چنانچہ بیوروکریسی نے سوچی سمجھی سازش کے تحت علامہ اسد کو سفیر بنا کر بیرونِ ملک بھیج دیا اور پیچھے ان کا کیا ہوا سارا کام جلا کر راکھ بنا دیا۔ گویا ہم بھول گئے تھے کہ اللہ ربّ العزت نے یہ ملک ہمیں کس مقصد کے تحت عطا کیا تھا۔ اس تناظر میں سورۂ یونس کی یہ آیت بھی قابلِ غور ہے:

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۴﴾

’’پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں زمین میں جانشین بنا دیا‘ تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیا کرتے ہو!‘‘

ہمارا کرنے کا اصل کام تو یہی تھا کہ ہم ’’پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ!‘‘ کو عملاً ثابت کرتے ہوئے اللہ کا دیا ہوا نظام قائم کرتے۔ یہی شکر گزاری کا تقاضا بھی تھا اور قائداعظم نے بھی اس حوالے سے علامہ اسد کو کام سونپ دیا تھا اور بالکل آخری وقت میں ’’خلافتِ راشدہ‘‘ کا لفظ خاص طور پر استعمال کر کے تلقین کر دی تھی کہ پاکستان کا نظام کیا ہوگا۔ نیز آپ نے پاکستان کے معاشی نظام کو بھی اسلامائز کرنے کے لیے سٹیٹ بینک پشاور کی بلڈنگ کے افتتاح کے موقع پر واضح طور پر فرمایا تھا:

’’مغرب کے معاشی نظام نے انسانیت کے لیے لاینحل مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ ہمیں دنیا کے سامنے ایک مثالی معاشی نظام پیش کرنا ہے جو انسانی مساوات اور معاشرتی انصاف کے سچے اسلامی تصورات پر قائم ہو۔‘‘

ناشکری کی سزا: اندرونی خلفشار اور بیرونی یلغار

قائداعظم‘ علامہ اقبال اور بانیانِ پاکستان کے واضح تصورات و نظریات کے باوجود

ہماری احسان فراموشی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اللہ کے دین کے ساتھ دشمنی اور اللہ کے دشمنوں کے ساتھ ہماری دوستیاں‘ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ غداری اور دشمنانِ دین کے ساتھ وفاداریاں‘ یہاں تک کہ سودی نظام کا سرکاری سطح پر دفاع کر کے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کا کھلم کھلا اعلان‘ یہ سب ہم نے کیا اور پھر کیا ہوا؟ صرف ۲۴ سال بعد اپنے سب سے بڑے دشمن سے ہمیں شکست ہوئی اور آدھا پاکستان ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ سبق ہم نے پھر بھی نہیں سیکھا۔ تاہم اللہ نے پھر بھی ہم پر اپنی عنایات جاری رکھیں۔ ہمیں ایٹمی قوت عطا کی اور ایک بار پھر اُٹھایا‘ لیکن ہم نے نہ سدھرنے کی قسم کھا رکھی ہے اس لیے ہم نہ سدھرے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

آج بھی ہمارے سیکولر دانشور کہتے ہیں پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہی نہیں تھا‘ بلکہ اب ہمارے یہی دانشور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ ایٹمی صلاحیت بھی ہمارے لیے وبالِ جان ہے‘ اصل فتنے کی جڑ ہے۔

بحیثیتِ قوم یہ ہمارا عظیم المیہ ہے کہ ہم نے ناشکری کی آخری حدوں کو بھی پار کر دیا اور نتیجہ میں آج ہم کہاں کھڑے ہیں! پاکستان ایسا ملک ہے جس میں ہر نعمت موجود ہے‘ کیا کچھ اللہ نے ہمیں عطا نہیں کیا‘ لیکن اس کے باوجود ہم آج محروم ہیں۔ ملک میں خانہ جنگی کی کیفیت ہے۔ افراتفری ہے‘ نفسا نفسی ہے۔ یہ سب کیوں ہے؟ قرآن ہمیں یہ بھی بتا رہا ہے:

﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ﴾

’’اور اللہ نے مثال بیان کی ہے ایک بستی کی جو بالکل امن واطمینان کی حالت میں تھی‘ آتا تھا اس کے پاس اس کا رزق بافراغت ہر طرف سے‘‘

یہاں بھی نہ داخلی طور پر کوئی انتشار تھا اور نہ باہر سے کوئی خطرہ تھا۔ رزق کے تمام ذرائع اللہ نے ہمیں فراہم کیے ہوئے تھے۔ ہر طرف امن و سکون تھا۔

﴿فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ﴾ ’’تو اُس نے ناشکری کی اللہ کی نعمتوں کی‘‘

ظاہر ہے شکر گزاری کا تقاضا تو یہی تھا کہ ہم اللہ کو واقعی اپنا رب مانتے کہ وہ حاکمِ اعلیٰ ہے‘ ہم نے اس کے نظام کے تحت زندگی گزارنی ہے۔ مگر ہم نے ناشکری کی۔

﴿فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝۱۱۲﴾ (النحل)

’’تو اسے چکھا (پہنا) دیا اللہ نے لباس بھوک اور خوف کا‘ اُن کے کرتوتوں کی پاداش میں۔‘‘

آج ہم پر بھی یہی دو عذاب بری طرح سے مسلط ہیں۔ شہروں میں تو کچھ فلائی اوور‘ اورنج ٹرین کے منصوبے بن رہے ہیں‘ سڑکیں اچھی بن رہی ہیں‘ لیکن مجموعی طور پر ملک کی نصف آبادی خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے اور اس شرح میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ عام آدمی کے ذرائع آمدن ہی نہیں ہیں۔ حکومت عوام کے روزگار‘ ان کی تعلیم‘ صحت‘ سکیورٹی کی ذمہ دار ہے۔ لیکن وہ اِس طرف بالکل توجہ نہیں دے رہی۔ عالمی سطح پر ہماری حیثیت یہ ہے کہ پاکستان دنیا کے ان تین ممالک میں شامل ہے جن کے شہریوں کو کسی بھی ملک کا ویزا مشکل سے ہی مل سکتا ہے۔ ان تین ممالک میں پہلے نمبر پر افغانستان‘ دوسرے پر پاکستان اور تیسرے پر عراق ہے۔ دنیا ہمیں قبول نہیں کر رہی اور دنیا بھر میں ہمیں ’’ناکام ریاست‘‘ سمجھا جا رہا ہے۔ کئی دفعہ باتیں سامنے آئی ہیں کہ یہ ملک فلاں سن تک کئی حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ اس کو تقسیم کرنے کی سازشیں مسلسل چل رہی ہیں۔ جن کے ہم سب سے زیادہ وفادار بنتے ہیں‘ وہ سب سے زیادہ سازشوں میں شریک ہیں۔ یہ سب کچھ ہمارے اپنے کرتوتوں کا ہی نتیجہ ہے۔ جیسے بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ سے بے وفائی کی تو قرآن میں ان کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ﴾ (البقرۃ:۶۱) ’’اور ان پر ذلت وخواری اور محتاجی وکم ہمتی تھوپ دی گئی‘‘۔ وہی کیفیت آج ہماری ہے کہ ذلت ومسکنت ہم پر تھوپ دی گئی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے انحراف کیا۔ یہ ہماری ذمہ داری تھی کہ ہم اس ملک میں اللہ کے دین کو قائم و نافذ کرتے اور بحیثیت مسلمان اللہ کے دین کے تقاضے پورے کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ ملک معجزانہ طور پر دیا تھا جو اللہ کی طرف سے انعام تھا‘ لیکن ہم نے اس کی ناشکری کی انتہا کر دی۔

پس چہ باید کرد؟

ابھی بھی وقت ہے کہ ہم اپنا قبلہ درست کریں اور اللہ تعالیٰ سے کیے گئے اپنے وعدے

کو پورا کریں اور اس ملک کو صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست بنانے کے لیے جدّ وجُہد کریں۔ والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ اس موقع پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی!

یعنی اب بھی موقع ہے۔ اس سے فائدہ اٹھائیں اور اجتماعی توبہ کریں اور اس چیز کو بھی پیش نظر رکھیں کہ ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

ایک اللہ کو معبودِ حقیقی مان کر اگر ہم اس کے آگے جھکیں گے تو ہر قسم کی غلامی اور اجارہ داری سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ آج اگر ہم سچی توبہ کرتے ہوئے اللہ کے دین کو بطور نظام قائم کرنا اپنا ہدف بنالیں تو (ان شاء اللہ) اللہ کی رحمت اور اس کی تائید ہمیں حاصل ہو جائے گی۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ۝۷﴾ (محمد)

”اے اہلِ ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور وہ تمہارے قدموں کو جمادے گا۔“

اب بھی اللہ تعالیٰ موقع دے رہا ہے‘ لیکن یہ موقع اس لیے نہیں ہے کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور کہیں کہ اللہ خود اپنا دین قائم کیوں نہیں کرتا؟ یہ طرزِ عمل تو ہمارے لیے مزید تباہیوں اور ہلاکتوں کا باعث ہوگا۔ یہ آزمائش ہماری ہے‘ یہ کام ہمیں ہی کرنا ہوگا‘ ورنہ کسی بھی وقت بڑا عذاب بھی آسکتا ہے جس کا ہم نے اپنے آپ کو اپنی کرتوتوں کے سبب مستحق بنالیا ہے۔ لیکن اللہ کی رحمت شاید ہمیں موقع دے رہی ہے یا کسی اور طفیل سے ہمیں موقع مل رہا ہے۔ بہرحال اس موقع سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے اور اس ملک کو صحیح معنوں میں ایک ایسی ریاست بنانا چاہیے جہاں اسلام کا دور دورہ ہو اور ہم دنیا کو اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا ایک نمونہ دکھا سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!!

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین○○

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الرُّوم

تمہیدی کلمات

سورۃ الروم کا آغاز رسول اللہ ﷺ کے زمانے کی دو بڑی سلطنتوں یعنی ایرانی سلطنت اور سلطنتِ روما کی باہمی چپقلش کے ذکر سے ہوا ہے اور اسی حوالے سے ابتدائی آیات میں ایک بہت بڑی پیشین گوئی کا ذکر بھی ہے۔ اس موضوع اور اس سے متعلق پیشین گوئی کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے اس کے تاریخی پس منظر سے آگاہی ضروری ہے۔

ایرانی سلطنت کی بنیاد آج سے کوئی ڈھائی ہزار سال قبل ایران کے عظیم بادشاہ کے خسرو (Cyrus) نے رکھی تھی' جسے ''ذوالقرنین'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف سلطنتِ روما نے بھی صدیوں سے خود کو ایک بہت بڑی طاقت کے طور پر منوا رکھا تھا۔ سلطنتِ روما کا بڑا حصہ تو یورپ کے علاقوں پر مشتمل تھا لیکن ترکی کا پورا علاقہ اور شام سمیت مغربی بحرِ روم (Mediterranean Sea) کے ساحلی علاقے بھی اس کے قبضے میں تھے۔ مذہب کے اعتبار سے رومی عیسائی تھے (۳۰۰ عیسوی میں پوری رومی سلطنت نے عیسائیت قبول کر لی تھی)' جبکہ ایرانی آتش پرست تھے۔ ان دونوں عالمی طاقتوں کے درمیان طاقت کے توازن میں پچھلی ایک صدی سے جھولے (sea saw) کی سی کیفیت تھی۔ جب کبھی ایرانیوں میں کوئی باصلاحیت حکمران برسرِاقتدار آتا تو وہ رومیوں کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیتا اور اسی طرح جب رومیوں کے کسی طاقتور بادشاہ کو موقع ملتا تو وہ ایرانیوں سے بہت سے علاقے خالی کرا لیتا۔

حضور ﷺ کی ولادت (۵۷۱ء) کے زمانے میں دونوں طاقتوں کی روایتی کشمکش جاری تھی۔ ۶۰۲ء میں اس کش مکش نے باقاعدہ ایک جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ اس وقت

حضور ﷺ کی عمر مبارک ۳۱ برس تھی۔ یہ جنگ بالآخر ۶۱۴ء میں ایران کے بادشاہ خسرو پرویز (کے خسرو ثانی) کے ہاتھوں رومیوں کی بدترین شکست پر ختم ہوئی۔ اس جنگ میں رومی سلطنت کو ترکی کے اہم شہروں سمیت اپنے بہت سے علاقوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ان کے مقدس شہر ایلیا (یہ یروشلم ہی کا دوسرا نام ہے۔ یروشلم ۷۰ عیسوی میں بالکل تباہ ہو گیا تھا' بعد میں رومی شہنشاہ ہیڈریان کے دور میں اسے ایلیا کے نام سے ازسرِنو آباد کیا گیا) کو بھی ایرانیوں نے تباہ و برباد کر دیا اور وہاں پر نصب مقدس صلیب بھی ان کے قبضے میں چلی گئی۔ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق یہ وہی صلیب تھی جس پر حضرت مسیح علیہ السلام کو مصلوب کیا گیا تھا۔

رومیوں کی اس شکست کے وقت مکہ میں حضور ﷺ کی دعوت شروع ہوئے تقریباً پانچ برس ہو چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اہل ایمان کے ساتھ مشرکین کی زیادتیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں اور مقامی آبادی واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ایرانیوں اور رومیوں کی جنگ میں مشرکین مکہ کی ہمدردیاں ایرانیوں کے ساتھ تھیں' اس لیے کہ وہ ایرانیوں کو آتش پرست (مشرک) ہونے کی وجہ سے اپنا ہم مذہب خیال کرتے تھے۔ دوسری طرف رومی چونکہ اہل کتاب تھے اس لیے مسلمان فطری طور ان کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے اور وہ ان کی شکست پر دل گرفتہ بھی تھے۔ ان حالات میں مشرکین مکہ رومیوں کی شکست پر بغلیں بجا رہے تھے اور دن رات اس پروپیگنڈا میں مصروف تھے کہ جس طرح آج آتش پرست ایرانیوں کے ہاتھوں پیغمبروں اور الہامی کتابوں کے ماننے والوں کو شکست ہوئی ہے کل اسی طرح ہم بت پرستی کے علمبردار بھی مسلمانوں کا قلع قمع کر دیں گے۔ اُس وقت مکہ کی سرزمین مسلمانوں پر تنگ کر دی گئی تھی اور ۶۱۵ء میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گھر بار چھوڑ کر حبشہ کی عیسائی سلطنت میں (جو سلطنتِ روم کی حلیف تھی) پناہ لینا پڑی تھی۔

ان حالات میں یہ سورت نازل ہوئی اور اس کی ابتدائی آیات میں واضح پیشین گوئی کی گئی کہ قریب کی سرزمین میں اس وقت واقعی رومی شکست کھا چکے ہیں' مگر چند ہی سال میں یہ صورت تبدیل ہو جائے گی اور وہ پھر سے ایرانیوں پر غالب آ جائیں گے۔ بظاہر چونکہ یہ بالکل اَنہونی بات تھی اس لیے مشرکینِ مکّہ نے اسے بھی تضحیک کا نشانہ بنایا۔ وہ اس پیشین گوئی کو اکثر موضوعِ گفتگو بنا کر مسلمانوں کو زچ کرنے کی کوشش کرتے۔ ایک مشرک اُبی بن خلف نے اس حوالے سے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے ساتھ شرط لگائی کہ اگر قرآن کی پیشین گوئی کے مطابق

تین سال کے اندر رومی غالب آ گئے تو دس اونٹ میں تمہیں دوں گا‘ ورنہ دس اونٹ تم کو دینا ہوں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ معاملہ حضورﷺ کے سامنے پیش کیا تو چونکہ اس وقت تک شرط وغیرہ کی حرمت کے بارے میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا اس لیے آپؐ نے اس کی اجازت دے دی‘ لیکن چونکہ لفظ ’’بِضْع‘‘ (چند) کا اطلاق گنتی کے اعتبار سے تین سے لے کر نو تک کے اعداد پر ہوتا ہے اس لیے آپؐ نے پیشین گوئی پورا ہونے کی مدت تین سال سے بڑھا کر نو سال جبکہ اونٹوں کی تعداد بڑھا کر سو کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے سو اونٹوں پر شرط پکی کر دی۔ ٹھیک نو سال بعد جب یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوگئی تو اُبی بن خلف کے وارثوں کو سو اونٹ حضرت ابوبکرؓ کے حوالے کرنے پڑے۔ اس وقت تک جوئے کی حرمت کی آیات نازل ہو چکی تھیں اس لیے حضورﷺ نے حکم دیا کہ وہ اونٹ صدقہ کر دیے جائیں۔

دوسری طرف روم کا ہرقل اعظم (Heraclius) اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے مسلسل منصوبہ بندی میں مصروف رہا۔ آٹھ سال بعد (۶۲۲ء میں جب نبی مکرمﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے) ہرقل نے حالات کو سازگار سمجھتے ہوئے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا اور ایک بڑے لشکر کے ساتھ خفیہ طور پر ایک لمبا چکر کاٹ کر بحیرہ کیسپین (Caspian Sea) کی طرف سے ایرانیوں کی پشت پر زوردار حملہ کر دیا۔ ایرانیوں کے لیے یہ حملہ بالکل غیر متوقع تھا۔ چنانچہ وہ اس کی تاب نہ لا سکے۔ نتیجتاً انہیں اس معرکے میں ذلت آمیز شکست ہوئی اور ہرقل ان سے اپنے مقبوضہ علاقے واگزار کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی سال اللہ کی مدد سے بدر میں مسلمانوں کو بھی فتح (الفرقان) نصیب ہوئی اور اس طرح اِن آیات کی دونوں پیشین گوئیاں حرف بحرف پوری ہوگئیں۔

آیات ۱ تا ۱۰

الٓمّٓ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿۳﴾
فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ ڛ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ
الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۴﴾ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۵﴾ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ

لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا
مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ښ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ
اَنْفُسِهِمْ ۣ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ
مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ﴿۸﴾ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي
الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَشَدَّ
مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَاۗءَتْهُمْ
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُوْنَ ﴿۹﴾ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْۗآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾

آیت ۱ ﴿الٓمّٓ ﴿۱﴾﴾ ’’الف‘ لام‘ میم‘‘

آیت ۲‘۳ ﴿غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿۳﴾﴾ ’’رومی مغلوب ہو گئے‘ قریب کی سرزمین میں۔ اور وہ اپنی اس مغلوبیت کے بعد عنقریب غالب آ جائیں گے۔‘‘

نقشے میں دیکھیں تو جزیرہ نمائے عرب کے اوپر شمال کی سمت میں شام ہے جبکہ شام کے ساتھ ہی نیچے عراق اور پھر عراق کے ساتھ مشرق کی سمت میں ایران واقع ہے۔ چنانچہ جزیرہ نمائے عرب کی سرحد پر واقع ان علاقوں کو قریب کی سرزمین کہا گیا ہے جہاں ایرانیوں اور رومیوں کے درمیان مذکورہ جنگ جاری تھی۔

آیت ۴ ﴿فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ ڛ﴾ ’’چند سالوں میں‘‘

عربی میں لفظ ’’بِضْع‘‘ کا اطلاق گنتی کے اعتبار سے تین سے نو تک کے اعداد پر ہوتا ہے۔ اسی لیے حضورﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو نو سال کی مدت تک شرط طے کرنے کا فرمایا تھا۔ واضح رہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت تک شرط یا جوئے کی حرمت کے بارے میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔

﴿لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ﴾ ’’اللہ ہی کا اختیار ہے‘ پہلے بھی اور بعد میں بھی۔‘‘

اللہ ہی کے حکم سے ہوا جو پہلے ہوا اور اللہ ہی کے حکم سے ہوگا جو بعد میں ہوگا۔ فرماں روائی تو ہر حال میں اللہ ہی کی ہے۔ پہلے جسے فتح نصیب ہوئی اُسے بھی اللہ نے فتح دی اور بعد میں جو فتح پائے گا وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے پائے گا۔

﴿وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۴﴾ ’’اور اُس دن اہلِ ایمان خوشیاں منا رہے ہوں گے۔‘‘

اس وقت اہلِ ایمان کو ایک خوشی تو آتش پرستوں پر اہلِ کتاب (عیسائیوں) کی فتح پر ہوگی اور اس کے علاوہ:

آیت ۵ ﴿بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝۵﴾ ’’(وہ خوش ہوں گے) اللہ کی مدد سے۔ وہ مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے۔ اور وہ زبردست‘ بہت رحم فرمانے والا ہے۔‘‘

یہاں اگرچہ ذکر نہیں کیا گیا لیکن اس سے غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی فتح مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی مدد سے انہیں عنقریب حاصل ہونے والی تھی۔

آیت ۶ ﴿وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۶﴾ ’’یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا‘ لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔‘‘

یہ وہ چھ آیات ہیں جن میں رومیوں کے دوبارہ غلبے اور اہلِ ایمان کی مشرکینِ مکہ پر فتح کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ یہ آیات تقریباً ۶۱۴ء میں نازل ہوئیں۔ نبی اکرم ﷺ پر وحی کا آغاز ۶۱۰ء میں ہوا تھا۔ چنانچہ ان آیات کے نزول کے وقت آپؐ کی دعوت کو پانچ برس کا عرصہ بیت چکا تھا۔ اس کے ٹھیک نو (۹) برس بعد اس پیشین گوئی کے عین مطابق رومی بھی ایرانیوں پر غالب آ گئے اور غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو بھی اللہ کی مدد سے فتح نصیب ہوئی۔

آیت ۷ ﴿یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ﴾ ’’یہ لوگ دنیا کی زندگی کے بھی صرف ظاہر کو جانتے ہیں۔‘‘

یہاں سے موضوع ’’التذکیر بآلاء اللّٰہ‘‘ (اللہ کی نعمتوں کے حوالے سے نصیحت اور یاددہانی) کی طرف موڑا جا رہا ہے اور اس مضمون کے اعتبار سے سورۃ الروم اور سورۃ النحل میں بہت گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔

﴿وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝۷﴾ ’’اور وہ آخرت سے بالکل ہی غافل ہیں۔‘‘

یہ دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے‘ لیکن یہ لوگ دنیا کی اس حقیقت کو بالکل فراموش کیے بیٹھے ہیں۔ انہیں یاد ہی نہیں کہ آج وہ یہاں جو بوئیں گے کل آخرت میں وہی کچھ انہیں کاٹنا ہوگا۔ ان کے سامنے دُنیوی زندگی کا صرف یہی پہلو رہ گیا ہے کہ کھاؤ‘ پیو اور عیش کرو‘ جبکہ آخرت کی زندگی کا تصور ان کے ذہنوں سے بالکل ہی اوجھل ہو گیا ہے۔

آیت ۸ ﴿اَوَلَمْ یَتَفَكَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ ۣ﴾ ’’کیا یہ لوگ اپنی ذات میں غور نہیں کرتے؟‘‘

﴿مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ﴾ ’’نہیں پیدا کیا اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے مگر حق کے ساتھ‘ اور ایک وقتِ معیّن تک کے لیے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات ایک مقصد کے تحت پیدا کی ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اقرار ہر وہ شخص کرتا ہے جو چشمِ بصیرت سے کائنات کا نظام دیکھتا ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۹۱ میں اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ جب وہ کائنات کی تخلیق کے بارے میں غور وفکر کرتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ﴾ ’’اے ہمارے پروردگار! (ہم سمجھ گئے ہیں کہ) تو نے یہ سب کچھ عبث پیدا نہیں فرمایا‘‘۔

﴿وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝۸﴾ ’’اور یقیناً بہت سے لوگ اپنے رب سے ملاقات کے منکر ہیں۔‘‘

آیت ۹ ﴿اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ﴾ ’’کیا یہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیسا انجام ہوا اُن لوگوں کا جو اِن سے پہلے تھے!‘‘

﴿كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً﴾ ’’وہ قوت میں ان سے کہیں زیادہ تھے‘‘

﴿وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا﴾ ’’اور انہوں نے زمین کو کاشت کیا اور اسے آباد کیا اس سے کہیں بڑھ کر جو (آج) انہوں نے آباد کیا‘‘

﴿وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ۭ﴾ ’’اور ان کے پاس بھی ان کے رسولؑ آئے

تھے کھلی نشانیاں لے کر۔''

﴿فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۹﴾ ''سو اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا' بلکہ انہوں نے خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا۔''

آیت ۱۰ ﴿ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓآى﴾ ''پھر ان لوگوں کا انجام جنہوں نے بُری روش اختیار کی' بہت برا ہوا''

﴿اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۱۰﴾ ''اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور وہ ان کا مذاق اڑاتے رہے۔''

آیات ۱۱ تا ۱۹

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۱۱ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ
يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۱۲ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا
بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝۱۳ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ۝۱۴ فَاَمَّا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ۝۱۵ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ۝۱۶ فَسُبْحٰنَ
اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝۱۷ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ۝۱۸ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ
وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝۱۹ ع

آیت ۱۱ ﴿اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ﴾ ''اللہ ہی پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے' پھر وہی اسے دوبارہ پیدا کرتا ہے''

یہ الفاظ قرآن حکیم میں بار بار آئے ہیں۔ یُعِیْدُہٗ فعل مضارع ہے اور اس لحاظ سے اس میں حال اور مستقبل دونوں زمانوں کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اگر اس کا ترجمہ فعل حال میں کیا جائے تو دنیا میں مخلوقات کی بار بار پیدائش (reproduction) مراد ہوگی' جیسے ایک فصل بار بار کٹتی ہے اور بار بار پیدا ہوتی ہے' جبکہ فعل مستقبل کے ترجمے کی صورت میں اس کا مفہوم عالَمِ آخرت میں انسانوں کے دوبارہ جی اٹھنے تک وسیع ہو جائے گا۔

﴿ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۱۱﴾ ''پھر اُسی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے۔''

آیت ۱۲ ﴿وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ۱۲﴾ ''اور جس دن قیامت قائم ہو جائے گی تو مجرم اُس دن مایوس ہو کر رہ جائیں گے۔''

آیت ۱۳ ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۱۳﴾ ''اور نہیں ہوں گے ان کے شریکوں میں سے کوئی بھی ان کے لیے سفارش کرنے والے' اور وہ خود بھی اپنے شریکوں کا انکار کرنے والے ہوں گے۔''

جب وہ دیکھیں گے کہ جن سے انہوں نے امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ ان کی کسی قسم کی کوئی مدد نہیں کر رہے تو وہ ان کے منکر ہو جائیں گے۔

آیت ۱۴ ﴿وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ۱۴﴾ ''اور جس دن قیامت قائم ہوگی اُس دن لوگ الگ الگ ہو جائیں گے۔''

بنی نوعِ انسان کی یہ تقسیم (polarization) کس بنیاد پر ہوگی؟ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

آیت ۱۵ ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ۱۵﴾ ''تو جو لوگ ایمان لائے تھے اور جنہوں نے نیک عمل کیے تھے وہ ایک باغ میں مسرور کیے جائیں گے۔''

آیت ۱۶ ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ۱۶﴾ ''اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا اور ہماری آیات اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا تھا تو وہ عذاب میں پکڑے ہوئے ہوں گے۔''

آیت ۱۷ ﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۱۷﴾ ''تو تم تسبیح کرو اللہ کی جب تم شام کرتے ہو اور جب تم صبح کرتے ہو۔''

آیت ۱۸ ﴿وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ۱۸﴾ ''اور اُسی کے لیے حمد ہے آسمانوں اور زمین میں' اور رات کو اور جب تم ظہر کرتے ہو۔''

ان دونوں آیات میں صبح' شام' رات اور دن ڈھلنے کے اوقات کا ذکر کر کے پانچوں

نمازوں کے اوقات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

آیت ۱۹ ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ ’’وہ نکالتا ہے زندہ کو مُردہ سے‘‘

مثلاً انڈے میں بظاہر زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے‘ لیکن اس میں سے اللہ کی قدرت سے زندہ چوزہ برآمد ہوتا ہے۔

﴿وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ ’’اور (اسی طرح) وہ نکالتا ہے مُردہ کو زندہ سے‘‘

مثلاً مرغی جاندار ہے اور اس سے انڈا برآمد ہوتا ہے جو بظاہر بے جان ہے۔ اسی طرح زندہ سے مُردہ اور مُردہ سے زندہ برآمد ہونے کی بہت سی مثالیں ہمارے اردگرد موجود ہیں۔

﴿وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ⑲﴾ ’’اور وہ زندہ کرتا ہے زمین کو اُس کے مُردہ ہو جانے کے بعد۔ اور اسی طرح تمہیں بھی نکال لیا جائے گا۔‘‘

جس طرح اللہ تعالیٰ بظاہر مردہ زمین سے فصلیں اور دوسرے نباتات نکالتا ہے اسی طرح وہ تمہیں بھی اس میں سے نکال کر حاضر کر لے گا‘ چاہے تمہارے اجزاء تحلیل ہو کر کسی بھی شکل میں ہوں اور کہیں بھی ہوں۔

آیات ۲۰ تا ۲۷

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ⑳ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ
اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً
وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ㉑ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ㉒
وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاۗؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ㉓ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ
السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّعْقِلُوْنَ ㉔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ۭ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ
دَعْوَةً ڰ مِّنَ الْاَرْضِ ڰ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ㉕ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ㉖ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ
عَلَيْهِ ۭ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ㉗

آئندہ آیات کا اسلوب اور انداز بہت منفرد ہے۔ ان میں اللہ کی خلّاقی کی علامات اور اس کی رحمت کے مظاہر کا ذکر تکرار کے ساتھ اس طرح ہوا ہے کہ ہر آیت کے آغاز میں وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اور آخر میں اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ کے الفاظ دہرائے گئے ہیں۔ قبل ازیں اس سے ملتا جلتا انداز ہم سورۃ النمل اور سورۃ الشعراء میں بھی دیکھ آئے ہیں۔ سورۃ النمل کے پانچویں رکوع میں بھی آفاقی و انفسی آیاتِ الٰہیہ کا ذکر اسی طرح تکرار کے ساتھ کیا گیا ہے اور ہر آیت کے آخر میں ءَاِلٰـــهٌ مَّعَ اللّٰهِ کے الفاظ آئے ہیں۔ جبکہ سورۃ الشعراء میں ایک تسلسل کے ساتھ عبرت انگیز تاریخی حقائق و بصائر کا ذکر ہوا ہے اور ہر واقعہ کے آخر میں اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ کے الفاظ کی تکرار ہے۔

آیت ۲۰ ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ⑳﴾ ’’اور اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اُس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا‘ پھر تم انسان بن گئے (زمین میں) پھیلے ہوئے۔‘‘

آیت ۲۱ ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ ’’اور اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اُس نے پیدا کیے تمہارے لیے تمہاری نوع میں سے جوڑے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو‘‘

﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ﴾ ’’اور اُس نے تمہارے مابین محبت اور رحمت پیدا کر دی۔‘‘

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ㉑﴾ ’’یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کریں۔‘‘

آیت ۲۲ ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ’’اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی تخلیق‘‘

﴿وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ﴾ ’’اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا فرق۔‘‘

پوری دُنیا کے انسانوں کے درمیان بولی جانے والی طرح طرح کی زبانوں کے اندر پایا جانے والا تنوّع بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے۔ اسی طرح مختلف خطوں میں بسنے

والے انسانوں کے مختلف رنگ بھی اُس کی صناعی اور خلاقی کے مظاہر کی مثالیں ہیں کہ کس طرح ایک ہی نسل سے تعلق کے باوجود کوئی زرد رو ہے تو کوئی سرخ رو' کوئی سفید فام ہے تو کوئی سیاہ فام۔

﴿اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔''

آیت ۲۳ ﴿وَمِنۡ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمۡ بِالَّیۡلِ وَالنَّہَارِ وَابۡتِغَآؤُکُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ؕ﴾ ''اور اُس کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارا اُس کے فضل کو تلاش کرنا۔''

تمہارا رات کے وقت سونا' دوپہر کے وقت قیلولہ کرنا' اور پھر آرام کے ان اوقات کے علاوہ معاشی دوڑ دھوپ میں سرگرمِ عمل رہنا بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت کی نشانیوں میں سے ہے۔

﴿اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ﴿۲۳﴾﴾ ''یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو سنتے ہیں۔''

یہ سب نشانیاں یقیناً ان لوگوں کے لیے ہیں جو انسانی کانوں یعنی دل کے کانوں سے سنتے ہیں' نہ کہ محض حیوانی کانوں سے۔

آیت ۲۴ ﴿وَمِنۡ اٰیٰتِہٖ یُرِیۡکُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا﴾ ''اور اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تمہیں بجلی (کی چمک) دکھاتا ہے خوف اور اُمید کے ساتھ''

آسمانوں میں بادلوں کا چھانا اور بجلی کا چمکنا بھی اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے جس میں لوگوں کو بجلی کے گرنے اور طوفان وغیرہ کا خوف بھی ہوتا ہے جبکہ بارانِ رحمت کے برسنے کی امید بھی۔

﴿وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحۡیٖ بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ؕ﴾ ''اور وہ برساتا ہے آسمان سے پانی' پھر زندہ کرتا ہے اس کے ذریعے سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد۔''

﴿اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۲۴﴾﴾ ''یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔''

آیت ۲۵ ﴿وَمِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ تَقُوۡمَ السَّمَآءُ وَالۡاَرۡضُ بِاَمۡرِہٖ ؕ﴾ ''اور اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ قائم ہیں آسمان و زمین اُس کے حکم سے۔''

ہماری زمین' سورج' نظامِ شمسی اور چھوٹے بڑے بے شمار ستاروں اور سیاروں کا ایک عظیم الشان اور لامتناہی نظام بھی اس کی قدرت کے مظاہر میں سے ہے۔ آج کا انسان جانتا ہے کہ اس نظام کے اندر ایسے ایسے ستارے بھی ہیں جن کے مقابلے میں ہمارے سورج کی جسامت کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ یہ اتنے بڑے بڑے اجرامِ سماویہ اللہ ہی کے حکم سے اپنے اپنے مدار پر قائم ہیں اور یوں اس کی مشیت سے کائنات کا یہ مجموعی نظام چل رہا ہے۔

﴿ثُمَّ اِذَا دَعَاکُمۡ دَعۡوَۃً ٭ۖ مِّنَ الۡاَرۡضِ ٭ۖ اِذَاۤ اَنۡتُمۡ تَخۡرُجُوۡنَ ﴿۲۵﴾﴾ ''پھر جب وہ تمہیں پکارے گا ایک ہی بار زمین سے (نکلنے کے لیے) تو تم دفعتاً نکل پڑو گے۔''

قیامت کے دن بھی اللہ تعالیٰ کی شان ''کُن فیکُون'' کا ظہور ہوگا اور اس کے ایک ہی حکم سے پوری نسلِ انسانی زمین سے باہر نکل کر اس کے حضور حاضر ہو جائے گی۔

آیت ۲۶ ﴿وَلَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوۡنَ ﴿۲۶﴾﴾ ''اور اُسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں۔ سب اُسی کے حکم کے تابع فرمان ہیں۔''

آیت ۲۷ ﴿وَہُوَ الَّذِیۡ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ وَہُوَ اَہۡوَنُ عَلَیۡہِ ؕ﴾ ''اور وہی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہے مخلوق کو پھر اسے دوبارہ بھی پیدا کرے گا اور وہ اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔''

یہ بعث بعد الموت کے بارے میں عقلی دلیل ہے جو قرآن میں متعدد بار دہرائی گئی ہے۔ معمولی سمجھ بوجھ کا انسان بھی اس دلیل کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ کسی بھی کام کا پہلی دفعہ کرنا دوسری دفعہ کرنے کے مقابلے میں نسبتاً مشکل ہوتا ہے' اور جب کسی کام کو ایک دفعہ سرانجام دے دیا جائے اور اس سے متعلق تمام مشکلات کا حل ڈھونڈ لیا جائے تو اسی کام کو دوسری مرتبہ کرنا نسبتاً بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اہلِ عرب جو قرآن کے مخاطب اول تھے' وہ اللہ کے منکر نہیں تھے۔ وہ تسلیم کرتے تھے کہ ان کا خالق اور اس پوری کائنات کا خالق اللہ ہی ہے۔ ان کے اس عقیدے کا ذکر قرآن میں بہت تکرار سے ملتا ہے۔ مثلاً: ﴿وَلَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ ؕ﴾ (لقمٰن:۲۵) ''اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے!''

چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں ان لوگوں کو خالص منطقی اور عقلی سطح پر یہ نکتہ سمجھانا مقصود ہے کہ جس اللہ کے بارے میں تم مانتے ہو کہ وہ زمین و آسمان کا خالق ہے اور خود تمہارا بھی خالق ہے اس کے بارے میں تمہارے لیے یہ ماننا کیوں مشکل ہو رہا ہے کہ وہ تمہیں دوبارہ بھی پیدا کرے گا؟ جس اللہ نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہ آخر دوسری مرتبہ ایسا کیوں نہیں کر سکے گا؟ جبکہ کسی بھی چیز کو دوسری مرتبہ بنانا پہلے کی نسبت کہیں آسان ہوتا ہے۔

﴿وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٧﴾﴾

''اور اُس کی شان بہت بلند ہے آسمانوں اور زمین میں' اور وہ بہت زبردست ہے' کمال حکمت والا۔''

یہاں پر اللہ تعالیٰ کے لیے ''مثل'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ لیکن مثل یا مثال کا جو مفہوم ہمارے ذہنوں میں ہے اُس کا اللہ کے بارے میں تصور کرنا مناسب اور موزوں نہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ ''مثل'' کا ترجمہ ''شان'' یا ''صفت'' سے کیا جائے کہ اس کی شان بہت اعلیٰ اور بلند ہے یا اُس کی صفت سب سے برتر ہے۔

❁❁❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانی تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو رویڈیو کیسٹس رسی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

مرتبۂ صدّیقیت اور سیرتِ صدّیقیؓ آئینۂ قرآن میں

بانیٔ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

صِدّیق کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

سب سے پہلے ہمیں لفظ 'صدیق' کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم متعین کر لینا چاہیے۔

صِدّیق کا لغوی مفہوم

لغوی اعتبار سے صدیق 'صدق' سے فَعِیل کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے۔ گویا اس کے لفظی معنی ہوئے: پیکرِ صدق و وفا' سراپا راستی اور مجسم سچائی۔

سب جانتے ہیں کہ سیرت و اخلاق کے جملہ محاسن میں صدق و راستی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ گویا وہ جملہ اوصافِ حسنہ کی اساس اور اُم ہے' جبکہ جھوٹ اور کذب کو اُم المعائب کا مقام حاصل ہے۔ وہ مشہور واقعہ بھی یقیناً آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور! مجھ میں بہت سے بڑے بڑے عیب ہیں لیکن میں ان سب کی بیک وقت اصلاح پر قادر نہیں ہوں' البتہ ان میں سے کوئی ایک جو آپ فرمائیں میں چھوڑ دوں گا۔ اس پر آنحضور ﷺ نے شراب نوشی اور بدکاری پر بھی ترکِ کذب کو مقدم رکھا۔ چنانچہ یہی ایک چیز اس کی مکمل اصلاح کا ذریعہ بن گئی۔

صدق اور صادق کا مقام ازروئے قرآن

قرآنِ حکیم کے مطالعے سے صدق کی جو عظمت سامنے آتی ہے اور یہ جس گھمبیر معنی اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اس کا کسی قدر اندازہ مندرجہ ذیل آیات سے ہوسکتا ہے۔

(۱) سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں حقیقی مؤمن کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾

''مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر' پھر شک نہیں کرتے اور جہاد کرتے ہیں اپنی جانوں اور اموال کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ حقیقت میں صرف یہی لوگ سچے ہیں!''

گویا ازروئے قرآن 'مؤمن' اور 'صادق' ہم معنی الفاظ ہیں۔

(۲) سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ میں نیکی کے ایک محدود مفہوم کی نفی اور نیکی کا حقیقی اور جامع تصور پیش کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ج وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ لا وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ج وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ج وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ج وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾﴾

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی جانب پھیر دو بلکہ حقیقی نیکی اُس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' فرشتوں پر' کتابوں پر اور انبیاء پر' اور دیا اس نے مال اس کی محبوبیت کے علی الرغم رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافر کو اور سائلوں کو اور گردنوں (کو آزاد کرانے) میں' اور قائم کی نماز اور ادا کی زکوٰۃ' اور نبھانے والے اپنے عہد کے جبکہ باہم کوئی معاہدہ کرلیں' اور خصوصاً صبر کرنے والے فاقوں میں' تکلیفوں میں اور جنگ کے وقت۔ یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقتاً سچے ہیں' اور یہی ہیں صحیح معنوں میں متقی۔''

گویا ازروئے قرآن نیکی' تقویٰ اور سچائی مترادف ہیں۔

(۳) سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۳ میں سچے مؤمنوں کی مدح میں فرمایا:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۡ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ...﴾

’’اہل ایمان میں وہ جواں مرد بھی ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا اپنا وہ عہد جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا۔ ان میں وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پیش کر چکے اور وہ بھی ہیں جو اس کے منتظر ہیں‘ (بہر نوع) انہوں نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی‘ تا کہ اللہ بھر پور صلہ دے سچوں کو ان کی سچائی کا۔‘‘

اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ سورۂ مریم (آیت ۵۴) میں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ......﴾ ’’یقیناً وہ وعدے کا سچا تھا......‘‘

تو یہ کتنی بڑی ستائش اور کیسی عظیم مدح ہے۔

(۴) سورۃ العنکبوت کے آغاز میں اہلِ ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ کے مستقل ضابطہ ابتلاء و آزمائش کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے ابتداءً فرمایا:

﴿فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳﴾﴾

’’اللہ یقیناً واضح کر کے رہے گا کہ کون سچے ہیں اور کون جھوٹے۔‘‘

اور چند ہی آیات کے بعد پردہ بالکل اٹھا دیا اور واضح الفاظ میں فرما دیا:

﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۱﴾﴾

’’اللہ یقیناً کھول کر رکھ دے گا کہ کون (واقعتاً) مؤمن ہیں اور کون (محض) منافق۔‘‘

گویا ’صادق‘ مؤمن ہے اور ’کاذب‘ منافق!

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سورۃ التوبہ میں منافقین کے مفصل ذکر اور طویل زجر و توبیخ اور لعنت و ملامت کے بعد جب یہ فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾﴾

’’اے اہلِ ایمان اللہ سے ڈرتے رہو اور سچے لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جاؤ۔‘‘

تو یہ کتنی جامع نصیحت ہے اور نفاق سے بچنے کی کتنی پُرزور تاکید!

’’تصدیق بِالحُسنٰی‘‘

’صدق‘ اور ’صادق‘ کے اس وسیع اور گھمبیر مفہوم کو ذہن میں رکھ کر مزید غور کیجیے تو یہ بات بالکل دو اور دو چار کی طرح یقینی نظر آئے گی کہ جو شخص خود سچا ہو اور جس کا اپنا موقف راستی اور صداقت پر قائم ہو‘ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ سچائی کا والہ و شیدا نہ ہو‘ یہاں تک کہ کوئی صداقت اس کے سامنے پیش کی جائے اور وہ اسے ردّ کر دے۔ اس کے بالکل برعکس ایسے شخص میں سچائی اور راستی کے لیے شدید حمیت پیدا ہو جانی لازمی ہے اور وہ ہر سچائی کو لپک کر قبول کرے گا اور ہر صداقت کی بڑھ کر تصدیق کرے گا اور اس راہ میں وہ نہ اپنی جھوٹی انا کو حائل ہونے دے گا نہ برخود غلط خودی کو‘ نہ کسی مصلحت کو آڑے آنے دے گا نہ کسی مفاد کو‘ نہ کسی خطرے کو خاطر میں لائے گا نہ اندیشے کو۔ نہ کسی سے کٹنا اسے گراں معلوم ہو گا نہ کسی سے جڑنا‘ نہ کوئی ’ترک‘ اسے بھاری محسوس ہو گا نہ ’اختیار‘ نہ کوئی ’امر‘ کٹھن نظر آئے گا نہ کوئی ’نہی‘ — بلکہ صدق اور صداقت کے ساتھ اس کا خلوص ان سب مراحل کو آسان بنا دے گا۔ گویا صدیق کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر صداقت کی تصدیق پر ہر دم اور ہر آن آمادہ ہو۔ اور قرآن حکیم کے الفاظ میں ’’تصدیق بِالحُسنٰی‘‘ صدیقیت کا وصف لازم ہے۔

صِدّیق کا اصطلاحی مفہوم

چنانچہ علامہ آلوسی صاحبِ تفسیر روح المعانی جب لفظ ’’صدیق‘‘ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

اَلْمُتَقَدِّمُ فِی التَّصدِیق وَالْمُبَالِغُ فِی الصِّدقِ وَالاخلاصِ فِی الاقوال والافعال

’’وہ شخص جو تصدیق میں پہل کرے اور خود اپنے اقوال و افعال میں حد درجہ سچا اور مخلص ہو۔‘‘

تو فنی اعتبار سے یقیناً یہ ایک بہت جامع و مانع تعبیر ہے‘ لیکن حقیقتِ صدّیقیت کی اتنی ہی جامع و مانع تعبیر موجود ہے قرآن حکیم کے ان حد درجہ مختصر لیکن انتہائی پُرشکوہ الفاظ میں کہ:

﴿وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖٓ﴾ (الزمر:۳۳)

’’وہ شخص جو خود بھی صداقت پر قائم رہا‘ اور ہر سچائی کی تصدیق بھی کرتا رہا۔‘‘

مرتبۂ صِدّیقیت

حضرات مُنعَم علیہم کے مراتب چہارگانہ کے پس منظر میں

قرآن حکیم کی روشنی میں مرتبۂ صدیقیت کے تعین اور حضراتِ صدیقین کے اوصاف و خصائص کے تفصیلی مطالعے سے قبل یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ صدیقیت بھی نبوت اور رسالت کی طرح قرآن حکیم کی ایک مستقل اصطلاح ہے‘ اور جس طرح نبوت ایک حقیقت معنوی ہے جس کا مصداق ظاہری خارج میں ہونا ضروری ہے اسی طرح صدیقیت کا مصداقِ خارجی بھی لازمی ہے۔

لہٰذا اگر کسی کے ذہن میں شعوری یا غیر شعوری طور پر‘ ایسا کوئی خیال یا گمان موجود ہو کہ شاید صدیقیت ایک بعد کا گھڑا ہوا خطاب یا القاب ہے‘ جو محض خوش عقیدگی یا حسن ظن کی بنیاد پر حضرت ابوبکرؓ کو عطا کر دیا گیا تو اسے اس سے تائب ہونا لازم ہے‘ اس لیے کہ یہ ایک مغالطہ ہی نہیں‘ بہت بڑی گمراہی ہے اور حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی یہ کہ نبوت اور رسالت کی طرح صدیقیت اور شہادت بھی قرآن حکیم کی مستقل اصطلاحات ہیں‘ اور جس طرح اوّل الذکر کے مصداق خارج میں موجود ہیں اسی طرح مؤخر الذکر کے مصداق بھی موجود ہیں‘ بلکہ جیسا کہ میں نے آغاز میں عرض کیا تھا‘ جس طرح مقامِ نبوت اور مرتبۂ رسالت کا مظہرِ اتم ہیں نبی اکرمﷺ اسی طرح مقام صدیقی اور مرتبۂ صدیقیت کا مصداقِ کامل ہیں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہُ۔

مُنعَم علیہم کے چار گروہ

اس سلسلے کی اہم ترین آیت سورۃ النساء کی آیت ۶۹ ہے جس میں نوعِ انسانی کے وہ خوش قسمت افراد جو انعام یافتہ یا منعم علیہم کہلانے کے مستحق ہیں‘ چار گروہوں میں منقسم قرار دیے گئے ہیں‘ یعنی: انبیاء کرام‘ صدیقین‘ شہداء اور صالحین۔ فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝۶۹﴾

’’اور جو اطاعت کرتا ہے اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) کی تو انہیں معیت حاصل ہوگی ان کی جن پر اللہ نے انعام فرمایا‘ یعنی انبیاء‘ صدیقین‘ شہداء اور صالحین۔ اور بہت ہی اچھے ہیں یہ لوگ بحیثیت رفیق۔‘‘

یہ آیۂ مبارکہ اس اعتبار سے انتہائی اہم ہے کہ اس میں سورۃ الفاتحہ کے ایک اجمال کی تفصیل ہے اور سورۃ الفاتحہ ہماری سب سے بڑی عبادت یعنی نماز کا جزو لازم ہے‘ بلکہ ایک حدیثِ قدسی کی رو سے عین نماز ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کا خاتمہ ایک دعا پر ہوتا ہے جس میں ہم اپنے رب سے استدعا کرتے ہیں: ’’اے رب! ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت بخش!‘‘ اور پھر اس سیدھے راستے کی مزید وضاحت کے ضمن میں عرض کرتے ہیں: ’’ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام فرمایا......الی آخر‘‘ — یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ منعم علیہم لوگ کون ہیں؟ اسی سوال کا جواب ہے جو سورۃ النساء کی محولہ بالا آیت میں دیا گیا ہے‘ یعنی یہ کہ یہ انعام یافتہ لوگ چار گروہوں پر مشتمل ہیں‘ انبیاء‘ صدیقین‘ شہداء اور صالحین۔

اس آیۂ کریمہ سے جہاں منعم علیہم کی چار گروہوں میں تقسیم واضح ہوئی وہیں یہ بھی واضح ہو گیا کہ ان کے مابین ترتیبِ مراتب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ نوعِ انسانی میں بلند ترین مرتبہ و مقام کے حامل تو‘ بلاشائبہ ریب وشک حضراتِ انبیاء ہیں‘ علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ ان کے متصلاً بعد مقام اور مرتبہ ہے صدیقین کرام کا۔ ان کے بعد ہیں حضرات شہداء اور سب سے آخر میں عام مؤمنین صالحین۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ گویا اس آیۂ کریمہ میں حضرات منعم علیہم کا ذکر مرتبہ و مقام کے اعتبار سے نزولی ترتیب کے ساتھ کیا گیا ہے۔

نبوّت اور صدّیقیت

جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے کہ مرتبۂ صدیقیت مقامِ نبوت کے متصلاً بعد اور اس کے بہت قریب واقع ہوا ہے تو اس کی شہادت قرآن حکیم کے بہت سے دوسرے

مقامات سے بھی حاصل ہوتی ہے‘ مثلاً:

(۱) قرآن حکیم میں حضرت مریم سلامٌ علیہا کو صراحتاً ’’صِدِّيقَه‘‘ کا خطاب دیا گیا۔ (المائدۃ:۷۵)

اب اگر ان کے اس مقام اور مرتبہ کو پیش نظر رکھا جائے جو قرآنِ مجید کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ:

﴿يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٢﴾﴾

(آل عمران)

’’اے مریم! اللہ نے تجھے چُن لیا ہے اور تجھے پاک کر دیا ہے اور تجھے منتخب فرما لیا ہے تمام جہانوں کی خواتین میں سے۔‘‘

اور دوسری طرف یہ حقیقت بھی سامنے رہے کہ نبوت کا دروازہ نوعِ انسانی کی صنفِ نازک پر بند رہا ہے تو یہ بات آپ سے آپ ثابت ہو جاتی ہے کہ بعد از نبوت افضل ترین مرتبہ صدیقیت کا ہے اور اعلیٰ ترین مدارج و مقامات صدیقین اور صدیقات کو حاصل ہیں!

(۲) سورۂ یوسف میں مذکور ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے زنداں کے ساتھیوں نے ’’صدیق‘‘ کہہ کر مخاطب کیا (یوسف:۴۶)۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو اسے صرف زنداں کے ان ساتھیوں ہی کا کلام قرار دیا جائے‘ اس صورت میں بھی اس عظیم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ نبی کی شخصیت کا نمایاں ترین وصف ’صدق‘ ہی ہے اور جن لوگوں پر ابھی نبی کی نبوت منکشف نہیں ہوئی ہوتی وہ اسے ’صدیق‘ ہی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ خود نبی اکرم ﷺ کو قبل از اجرائے وحی اہلِ مکہ نے ’’الصادق‘‘ ہی کا خطاب دیا تھا ——— یا دوسری صورت یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ زنداں کے ساتھیوں کا کلام اللہ تعالیٰ نے اپنے الفاظ میں نقل فرمایا ہے۔ اس صورت میں واحد ممکن تاویل یہ ہے کہ اُس وقت تک حضرت یوسف علیہ السلام پر وحی نبوت کا اجرا نہیں ہوا تھا اور ابھی آنجناب صرف صدیقیت کے مقام پر فائز تھے ——— بہرصورت مقامِ صدیقیت اور مرتبۂ نبوت کا قرب اظہر من الشمس ہے۔

(۳) سورۂ مریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دو جلیل القدر انبیاء یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت ادریس علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ﴿اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿﴾ (آیات ۴۱ و ۵۶) ’’بے شک وہ صدیق نبی تھا!‘‘ جس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف یہ کہ مقام صدیقیت اور مرتبہ نبوت ایک دوسرے سے بہت قریب واقع ہوئے ہیں بلکہ صدیقیت نبوت کی تمہید ہے اور نبوت صدیقیت کی اگلی منزل!

صِدّیقین اور شہداء

منعم علیہم کے مراتب چہارگانہ میں سے نبوت تو ظاہر ہے کہ ہے ہی خالص وہبی‘ یعنی پہلے بھی صرف ذاتی قابلیت وصلاحیت اور محنت و ریاضت سے حاصل نہیں کی جا سکتی تھی‘ بلکہ جسے بھی ملتی تھی خالص عطیہ الٰہی اور فضل خداوندی ہی کے طور پر ملتی تھی اور اب تو اس کا دروازہ سرے سے ہی بند ہے‘ البتہ صدیقیت اور شہادت[1] کے مراتب عالیہ پہلے بھی کھلے تھے اور اب بھی نہ ’’مقطوعہ‘‘ ہیں نہ ’’ممنوعہ‘‘ بلکہ مؤمنین صالحین اپنی ہمت اور محنت کے مطابق اور مزاجِ شخصی وافتادِ طبعی کی مناسبت سے ان مراتبِ عالیہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں‘ گویا بقول جگر:

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن لیکن اپنا اپنا دامن!!

یہی وہ حقیقت ہے جو سورۃ الحدید کی آیت ۱۹ میں بیان ہوئی ہے اور جس کے بارے میں بہت سا قیل وقال صرف اس لیے ہوا کہ سیاقِ کلام اور ربطِ آیات پیشِ نظر نہیں رہا۔ چنانچہ جب سلسلہ کلام سے صرفِ نظر کرتے ہوئے نگاہ صرف اس ایک آیت کے

(۱) واضح رہے کہ اس پوری بحث میں شہادت کا لفظ عام معروف معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ قرآنِ حکیم کی ایک مخصوص اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ عجیب بات ہے کہ پورے قرآنِ مجید میں کسی ایک مقام پر بھی شہادت کا لفظ خدا کی راہ میں قتل ہونے کے معنی میں استعمال نہیں ہوا‘ اور سوائے ایک مقام کے کہیں بھی شہید کے معنی مقتول فی سبیل اللہ نہیں لیے جا سکتے۔ وہ ایک استثنائی مقام سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۰ ہے اور یہاں بھی جہاں شہداء کے معنی مقتولین فی سبیل اللہ لینے کی گنجائش ہے وہاں اتنی گنجائش عام اصطلاحی معنوں کی بھی ہے۔ بہرحال اس بحث میں لفظ شہادت اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں مستعمل ہے!

الفاظ پر مرتکز ہوگئی کہ:

﴿وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖۤ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصِّدِّیۡقُوۡنَ ٭ۖ وَالشُّہَدَآءُ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ﴾

’’اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر‘ تو یہی ہیں صدیق اور شہداء اپنے رب کے نزدیک۔‘‘

تو ایک الجھن پیدا ہوگئی کہ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مؤمن صدیق اور شہید ہے‘ جبکہ یہ بات بالبداہت غلط معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اس اشکال کے حل کی کوششیں کی گئیں اور بہت سی آراء اور بے شمار اقوال کا ذخیرہ کتب تفسیر میں جمع ہوگیا‘ حالانکہ اگر سیاقِ کلام پر نگاہ رکھی جائے تو یہاں کوئی اشکال یا الجھن سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

دراصل اس آیت کے صحیح فہم کے لیے اس سے پہلے کی تین آیات اور ان کے باہمی ربط کو سمجھنا ضروری ہے‘ وھو ھذا:

آیت ۱۶ میں اہل ایمان (گویا عام مؤمنین صالحین) کو جھنجھوڑا گیا ہے کہ کس تاخیر وتعویق میں پڑ گئے ہو اور کیوں قدم آگے نہیں بڑھاتے؟ اور متنبہ کیا گیا ہے کہ مبادا تم بھی یہود کے مانند ہو جاؤ جن کے دل امتدادِ زمانہ سے سخت ہوتے چلے گئے اور اب ان کی اکثریت فساق وفجار پر مشتمل ہے۔ گویا یہ آیت زجر وتہدید اور تنبیہ وترہیب پر مشتمل ہے۔

آیت ۱۷ میں قرآنِ حکیم کے عام اسلوب کے مطابق ترغیب وتشویق کا اسلوب ہے اور حوصلہ بندھایا گیا ہے کہ اگر تم اپنے دلوں میں سختی محسوس کرو تب بھی مایوس مت ہونا۔ اللہ تعالیٰ جس طرح زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد حیاتِ تازہ عطا فرما دیتا ہے اسی طرح تمہاری کشت قلوب کو بھی حیاتِ نو عطا فرما دے گا اور تمہارے دلوں کی کھیتی پھر ایمانِ حقیقی کی ہری بھری فصل سے لہلہا اٹھے گی!

اگلی آیت میں گویا ’سلوکِ قرآنی‘ کی وضاحت کر دی گئی اور اس عمل تزکیہ کی نشاندہی کر دی گئی جس سے کشتِ قلوب میں ایمان کی فصلِ تازہ کی امید کی جاسکتی ہے‘ یعنی یہ کہ اگر دلوں کی کھیتی میں تازہ بہار چاہتے ہو تو پہلے اس میں صدقہ وخیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کا ہل چلاؤ اور حُبِّ دنیا اور حُبِّ مال کی نجاستوں سے دلوں کو پاک کرو‘ اس

لیے کہ اصل میں یہی تمہاری ترقی کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ اور تمہاری فطری استعدادات کے بروئے کار آنے میں سب سے بڑا مانع ہے۔

بعدہٗ آیت ۱۹ میں واضح فرما دیا کہ اگر یہ مورچہ تم نے سر کر لیا اور یہ منزل طے کر لی تو پھر کوئی رکاوٹ نہیں۔ اب ترقی کا راستہ بالکل کھلا ہے اور تم اپنی اپنی ہمت اور محنت کے مطابق اور اپنے اپنے مزاج اور افتادِ طبع کی مناسبت سے صدیقیت یا شہادت کے مراتبِ عالیہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہو۔

گویا یہاں ربط کلام وہی ہے جو سورۃ البلد میں ہے۔ وہاں اسی مورچے یا منزل کو ایک دشوار گزار گھاٹی(۱) سے تشبیہہ دی گئی ہے اور نہایت تأسف اور حسرت کے پیرائے میں فرمایا گیا ہے کہ اگرچہ ہم نے انسان کو بے شمار ظاہری اور باطنی استعدادات سے نواز کر دنیا میں بھیجا۔ چنانچہ اسے ﴿عَیۡنَیۡنِ﴾ بھی دیے اور ﴿لِسَانًا وَّشَفَتَیۡنِ﴾ بھی‘ اور پھر درجہ بدرجہ نوعی‘ جبلی اور فطری ہدایتوں سے نوازا‘ تاآنکہ ﴿ہَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ﴾ کی منزل بھی طے کرا دی‘ لیکن یہ کم ہمت اور تھڑدلا اس گھاٹی میں نہ گھس پایا! جانتے ہو کون سی گھاٹی؟ ’’کسی گردن کا چھڑا دینا یا کھانا ہی کھلا دینا‘ قحط کے ایام میں‘ کسی یتیم کو جو قرابت دار بھی ہو‘ یا مسکین کو جو خاک میں رل رہا ہو!‘‘ (کاش کہ کر پاتا وہ اس گھاٹی کو عبور!) اور پھر جا شامل ہوتا ان نفوسِ قدسیہ میں جو ایمان‘ تواصی بالصبر اور تواصی بالمرحمہ ایسے اوصافِ جلیلہ سے متصف ہیں —— فرق صرف یہ ہے کہ سورۃ البلد میں درمیان میں کلمہ ’’ثُمَّ‘‘ آ گیا جس نے ربطِ کلام کو واضح کر دیا‘ جبکہ سورۃ الحدید میں اس کی جگہ پر صرف حرفِ عطف ’’وَ‘‘ آیا جس سے ربطِ کلام قدرے مخفی ہوگیا!

بہرحال سورۃ الحدید کی آیت ۱۹ سے یہ حقیقت بھی ہر شک وشبہ سے بالاتر ہو کر ثابت ہوگئی کہ ’صدیقین‘ اور ’’شہداء‘‘ قرآن حکیم کی مستقل اصطلاحات ہیں‘ اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ یہی وہ بلند ترین مقامات ہیں جن تک اکتسابًا رسائی ممکن ہے۔

---

(۱) پنجابی زبان کے ایک شاعر عبداللہ شاکر کی ایک طویل نظم کے ترجیعی بند کے یہ الفاظ اس مضمون کو خوب ادا کرتے ہیں کہ ع اوکھی گھاٹی مشکل پینڈا عشق دیاں اسواراں دا!

اس معاملے میں مزید انشراحِ صدر کے لیے مناسب ہے کہ منعم علیہم کے مراتب چہارگانہ کے باہمی ربط وتعلق کو نفسیاتِ انسانی کی گہرائیوں میں اتر کر سمجھ لیا جائے اور طبائع کے فطری فرق اور مزاج و افتاد اور رجحانِ طبعی اور میلانِ نفسی کے فطری اختلاف کے حوالے سے قرآن حکیم کی ان چار اصطلاحوں کا گہرا فہم حاصل کر لیا جائے۔

ذرا دقتِ نظر سے مشاہدہ کیا جائے تو تمام انسان مزاجِ شخصی‘ افتادِ طبعی اور فطری رجحانات و میلانات کے اعتبار سے دو گروہوں میں منقسم نظر آئیں گے:

ایک وہ نسبتاً خاموش‘ تنہائی پسند‘ ذہین‘ حسّاس‘ سنجیدہ اور متفکّر المزاج لوگ جو خارج کی دنیا سے زیادہ اپنے باطن میں مگن رہتے ہیں اور باہر کی دنیا اور اس کی دلچسپیوں سے زیادہ انہیں خود اپنے ہی دل و دماغ کی گہرائیوں میں غوطہ زنی محبوب ہوتی ہے‘ گویا وہ ’’تن کی دنیا‘‘ سے کہیں زیادہ ’’مَن کی دنیا‘‘ کے باسی ہوتے ہیں۔ اور دوسرے وہ خوش باش‘ بے فکرے‘ چست‘ فعال اور لاابالیانہ طبیعت کے حامل بلکہ نٹ کھٹ قسم کے لوگ جن کی اصل دلچسپی خارج کی دنیا سے ہوتی ہے اور وہ اس میں پوری طرح مصروف اور مگن رہتے ہیں! غور وفکر‘ سوچ بچار اور تفکر و اعتبار سے انہیں طبعاً کوئی مناسبت ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس انہیں یا تو کھیل کود کا شوق ہوتا ہے یا سیر و شکار کا یا شہ زوری اور پہلوانی کا!

پہلی قسم کے لوگوں کو نفسیاتِ جدیدہ کی اصطلاح میں بروں بیں (extrovert)— کہتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگوں کو دروں بیں (introvert) —— فطری طور پر پہلی قسم کے لوگوں کے قوائے فکریہ بہت مضبوط اور ترقی یافتہ (developed) ہوتے ہیں جبکہ قوائے عملیہ نسبتاً خوابیدہ (dormant) رہ جاتے ہیں‘ اور اس کے برعکس دوسری قسم کے لوگوں کے قوائے فکریہ دبے رہ جاتے ہیں جبکہ قوائے عملی پوری شان کے ساتھ نشوونما پاتے ہیں۔

ان دو کے علاوہ انسانوں کی ایک تیسری قسم جو بہت شاذ ہے‘ ان لوگوں پر مشتمل

ہے جن کے قوائے فکری بھی نہایت بیدار اور ترقی یافتہ ہوتے ہیں اور قوائے عملیہ بھی پورے چاق و چوبند اور کامل نشوونما یافتہ ہوتے ہیں اور ان دونوں کے مابین ایک حسین توازن بھی موجود ہوتا ہے۔ انہیں جدید نفسیات کی اصطلاح میں ambivert کہا جاتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اصلاً یہی لوگ حاصلِ نوعِ انسانی ہیں۔ ایسے لوگ اوّل تو ہوتے ہی بہت کم ہیں اور ان میں بھی وہ لوگ تو بالکل معدوم ہی کے حکم میں ہیں جن کے قوائے فکری و عملی میں کامل توازن موجود ہو! غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بھی کسی میں پہلا رنگ قدرے نمایاں تر ہوتا ہے اور کسی میں دوسرا۔

ان تینوں میں سے اعلیٰ ترین رتبہ تو ظاہر ہے کہ قسم ثالث کے لوگوں کا ہے‘ ان کے بعد نمبر قسم اول کے لوگوں کا ہے‘ اس لیے کہ انسان حیوانات سے ممتاز بہرحال اپنے قوائے فکری و عقلی ہی کی بنا پر ہے‘ اور تیسرے درجے میں دوسری قسم کے لوگ ہیں جو فعال تو اگرچہ بہت ہوتے ہیں لیکن غور و فکر اور سوچ بچار کم کرتے ہیں۔

حضرات منعم علیہم میں سے صدیقین پہلی قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور شہداء دوسری قسم کے۔ حضرات صدیقین ابتدا ہی سے طبعِ سلیم کے مالک ہوتے ہیں جو عبارت ہے عقلِ صحیح اور قلبِ سلیم دونوں کے مجموعے سے۔ چنانچہ ایک طرف ان کی اخلاقی حس شروع ہی سے زندہ و بیدار ہوتی ہے اور نہ صرف یہ کہ خیر و شر‘ نیکی و بدی اور ظلم و جور اور عدل و انصاف کا فرق ان پر واضح رہتا ہے بلکہ ان کی طبیعت کا فیصلہ کُن میلان جانبِ خیر اور سمتِ عدل و ادائے حقوق ہی میں رہتا ہے اور دوسری طرف ان پر تعقّل و تفکّر کا غلبہ بھی ابتدا ہی سے ہوتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جستجوئے حق اور اکتشافِ حقیقت کا ایک زوردار داعیہ ان کے نفوس میں پیدا ہو جاتا ہے‘ چنانچہ ایک جانب ان کی عقلِ سلیم کتابِ فطرت اور صحیفۂ کائنات کے مطالعے سے حقائقِ کونیہ کے عین در پر جا دستک دیتی ہے تو دوسری جانب انہیں اپنے آئینۂ قلب میں حقیقت الحقائق کا دھندلا سا عکس بھی نظر آنے لگتا ہے — یہی وجہ ہے کہ جونہی کسی نبی کی دعوت ان کے کانوں میں پڑتی ہے وہ والہانہ لبیک کہتے ہوئے دوڑ پڑتے ہیں اور انہیں بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا!

اس کے برعکس حضراتِ شہداء کے قلوب واَذہان پر ابتداءً ان کے رجحاناتِ طبعی اور میلاناتِ نفسی کے باعث ایک غلاف سا چڑھا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں نبی کی دعوت پر لبیک کہنے میں دیر لگ جاتی ہے۔ یہ تاخیر اصلاً تو صرف بے توجہی اور لاابالی پن کے باعث ہوتی ہے لیکن ان میں سے بعض اپنے آبائی تعصّبات کے باعث شروع میں نبی کی مخالفت اور مزاحمت میں حد درجہ سرگرم بھی ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے قلوب و اذہان کا غلاف بھی اکثر و بیشتر کسی عقلی یا استدلالی اپیل سے نہیں بلکہ جذباتی انگیخت ہی سے پھٹتا ہے۔ لیکن پھر ہوتا یہ ہے کہ جیسے ہی اس غلاف میں شگاف پڑتا ہے گویا سارا فاسد مواد ایک دم خارج ہو جاتا ہے اور دعوتِ حق کو قبول کرنے کے بعد جب وہ برسرِ عمل ہوتے ہیں تو اپنے فطری جوشِ عمل اور جذبۂ کار کے باعث بظاہر صدیقین پر بھی بازی لے جاتے ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کے ان الفاظ کا مصداقِ کامل بن جاتے ہیں کہ ''کتنے ہی ہیں جو بعد میں آتے ہیں لیکن اگلوں کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں!'' —— یہ عرض کرنا تحصیلِ حاصل ہے کہ فرائضِ رسالت کی ادائیگی میں کم از کم بظاہر احوال حضراتِ شہداء ہی انبیاء کرام علیہم السلام کے اصل دست و بازو نظر آتے ہیں۔

کبارِ صحابہؓ میں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا صدیقیت کاملہ کی نہایت درخشاں مثالیں ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ طبقہ شہداء کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں!

جہاں تک حضرات منعم علیہم کے چوتھے گروہ کا تعلق ہے‘ یعنی حضراتِ صالحین تو یہ وہ عامۃ المؤمنین ہیں جن میں استعداد اور صلاحیت تو موجود ہوتی ہے لیکن ابھی اس کا کوئی نمایاں ظہور کسی خاص رخ پر نہیں ہوا ہوتا۔ مزاج اور افتادِ طبع کے اعتبار سے ان میں پہلی دونوں ہی قسموں کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ گویا ان میں بِالقُوَّہ (potentially) تو صدیقین بھی ہوتے ہیں اور شہداء بھی ہوتے ہیں‘ لیکن ابھی وہ ترفّع انہیں بالفعل

(actually) حاصل نہیں ہوا ہوتا۔ البتہ اگر وہ اپنی ہمت کو مجتمع کر کے محنت کریں اور خصوصاً حُبِّ دنیا کی نجاست سے اپنے دل کو پاک کر لیں جس کا سب سے بڑا علم اور نشان (symbol) حُبِّ مال ہے‘ تو جیسا کہ سورۃ الحدید کی آیات ۱۶ تا ۱۹ اور سورۃ البلد کے حوالے سے مفصل بیان کیا جا چکا ہے‘ وہ اپنے مزاج اور افتادِ طبع کی مناسبت سے صدیقیت یا شہادت کے مراتب عالیہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ یعنی جن لوگوں کو بالفعل ترفع حاصل ہو جاتا ہے وہ اگر قسم اول سے تعلق رکھتے ہوں تو زمرۂ صدیقین میں شامل ہو جاتے ہیں اور اگر طبقہ ثانیہ سے ہوں تو حلقہ شہداء میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی سمجھ لیا جائے تو اچھا ہے کہ اہلِ تصوف کی اصطلاح میں پہلی قسم کے لوگ ’سالک مجذوب‘ کہلاتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ ’مجذوب سالک‘!

رہے انبیاء کرام علیہم السلام تو اگرچہ نبوت ایک خالص وہبی اور عطائی ملکہ ہے اور اللہ جسے چاہے یہ نعمتِ عظمیٰ عطا فرما دے‘ تاہم بفحوائے آیہ قرآنی: ﴿اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ﴾ (الانعام:۱۲۴) ''اللہ بہتر جانتا ہے کہاں رکھے اپنی رسالت!'' ان کا انتخاب قسم ثالث کے لوگوں ہی میں سے ہوتا ہے جن کی عقلی وفکری قوتیں بھی انتہائی بلندیوں کو چھو رہی ہوتی ہیں اور فعل و عمل کی قوتیں بھی پورے جوبن پر ہوتی ہیں اور پھر ان دونوں کے مابین ایک حسین توازن بھی موجود ہوتا ہے۔ گویا ہر نبی اپنے مزاج کے اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے صدیق بھی ہوتا ہے اور شہید بھی۔ اگرچہ ان دونوں اجزائے ترکیبی کی کسی ذاتِ واحد میں بیک وقت بتمام وکمال موجودگی حد درجہ شاذ بلکہ حقیقتاً کالمعدوم کے حکم میں ہے۔ چنانچہ جن انبیاء و رسل علیہم السلام کے حالات تفصیل سے معلوم ہیں ان میں ان دونوں قوتوں کی بیک وقت بتمام وکمال موجودگی اور پھر ان کے مابین کامل توازن کی مثال تو ایک ہی ہے اور وہ ہے ذاتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ باقی حضرات بھی اگرچہ اپنے اپنے مقام پر نہایت جامع الصفات شخصیتوں کے مالک ہیں‘ تاہم کسی میں رنگِ صدیقیت نمایاں تر ہے‘ جیسے حضرت ادریس‘ حضرت ابراہیم اور حضرت یوسف اور کسی میں رنگِ شہادت زیادہ نمایاں ہے‘ جیسے حضرت نوح‘ حضرت اسماعیل اور حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام۔

یہاں اس حقیقت کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ نبوت اور رسالت دو مختلف یا علیحدہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ یہ بات تو صد فی صد درست ہے کہ نبوت عام ہے اور رسالت خاص۔ یعنی ہر رسول تو لازماً نبی بھی ہوتا ہے لیکن ہر نبی لازماً رسول نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ حقیقت بھی صد فی صد صحیح ہے کہ منکرین اور مخالفین پر فیصلہ کن غلبے کا وعدہ بھی صرف رسولوں سے ہے انبیاء سے نہیں۔ لیکن جس کسی نے یہ سمجھا ہے کہ رسالت مرتبہ و مقام کے اعتبار سے نبوت سے بلند تر ہے اسے یقیناً مغالطہ ہوا ہے۔

نبوت اور رسالت کے باہمی تعلق کو سرسری طور پر تو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ نبوت ایک حیثیت یا رتبہ (class or cader) ہے اور رسالت ایک عہدہ یا منصب (position or appointment) ہے۔ جیسے مثال کے طور پر سی ایس پی ایک حیثیت یا رتبہ ہے اور کسی ضلع کی ڈپٹی کمشنری ایک عہدہ یا منصب ہے۔ جس کسی نے سی ایس پی کا امتحان پاس کر لیا اس کی ایک حیثیت متعین ہو گئی۔ یہ مثال ہے نبوت کی۔ اور جب اس کی تعیناتی کسی ضلع کے ڈی سی کی حیثیت سے ہو گئی تو یہ ایک منصب ہے جو اسے ملا۔ یہ مثال ہے رسالت کی[1]۔ اب ظاہر ہے کہ اصل اعتبار حیثیت کا ہے جو مستقل ہے‘ نہ کہ منصب کا جو بدل بھی سکتا ہے۔

اور اگر اسی حقیقت کو مزید گہرائی میں سمجھنا ہو تو اہلِ تصوف کی اصطلاحات سے مدد لینی ہو گی۔ نبوت مرتبہ عروج میں ہے سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ دونوں کو‘ جبکہ رسالت مرتبہ نزول میں ہے اور عبارت ہے سیر عن اللہ الی اللہ سے۔ گویا نبوت کا اصل رُخ خدا کی جانب ہے اور یہ معراج ہے حیثیتِ عبدیت کی اور اس کے متصل واقع ہے مقام صدیقیت‘ جبکہ رسالت کا اصل رخ خلق کی جانب ہے اور اس کے قریب تر ہے مرتبہ

(۱) یہی رمز ہے سورۃ الاحزاب کی اس مشہور آیت کے اسلوبِ خطاب میں کہ ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿۴۵﴾﴾

شہادت —— مزید واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ صدیقیت ظل ہے مقام نبوت کا اور شہادت ظل ہے مرتبہ رسالت کا!

رسالت اور شہادت

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں رسالت اور شہادت کا ذکر اکثر لازم و ملزوم کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ جیسے:

(۱) ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاھِدًا عَلَیْکُمْ ......﴾ (المزمّل:۱۵)
’’ہم نے بھیج دیا ہے تمہاری طرف ایک رسول تم پر گواہ بنا کر۔‘‘

(۲) ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا......﴾ (الاحزاب:۴۵)
’’ہم نے بھیجا ہے تمہیں گواہ بنا کر۔‘‘

(۳) ﴿لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ ......﴾ (الحج:۷۸)
’’تاکہ ہو جائے رسول گواہ تم پر۔‘‘

(۴) ﴿وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا ط﴾ (البقرۃ:۱۴۳)
’’اور ہو جائے رسول تم پر گواہ!‘‘

گویا بعثتِ رسل کی اصل غرض و غایت بھی شہادت ہے اور کارِ رسالت کی نسبتِ باطنی بھی شہادت ہی کی جانب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ‘ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا‘ فرائض رسالت کی ادائیگی میں انبیاء کرام علیہم السلام کے اصل دست و بازو حضراتِ شہداء ہی بنتے ہیں۔ اور یہیں سے سمجھ میں آ سکتا ہے تفسیر و تاویل قرآن کا وہ غامض نکتہ کہ کیوں سورۂ مریم میں دو جلیل القدر انبیاء کو تو‘ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ’’صِدِّیْقًا نَّبِیًّا‘‘ قرار دیا گیا اور دو ہی کو ’’رَسُوْلًا نَّبِیًّا‘‘ کہا گیا۔ قرآن حکیم میں کوئی لفظ بے معنی نہیں اور کوئی ترکیب خالی از حکمت نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم ہی سرسری طور پر گزر جائیں اور ’’علاجِ تنگیٔ داماں‘‘ سے صرفِ نظر کر کے صرف ’’چند کلیوں پر قناعت‘‘ کی روش اختیار کر لیں۔ بات بالکل واضح ہے کہ‘ جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا‘ حضرت ادریس اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے مزاج میں رنگِ صدیقیت نمایاں ہے‘ گویا ان کا انتخاب صدیقین کے زمرے میں سے

ہوا تھا‘ لہٰذا وہ صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا قرار پائے اور حضرت اسماعیل اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے مزاج میں رنگ شہادت نمایاں تر ہے‘ جو اَقرب اور اَنسب ہے مرتبہ رسالت سے‘ پس وہ رَسُوۡلًا نَّبِیًّا قرار پائے۔ گویا ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیو!
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

سیرتِ صِدّیقیؓ کے عناصر ترکیبی

سُورۃ اللّیل کی روشنی میں

حضرات منعم علیہم کے مراتب چہارگانہ کے پس منظر میں مرتبۂ صدیقیت کے تعین کے بعد اب آیئے کہ قرآن حکیم ہی سے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ مقامِ صدیقی کے خصائص کیا ہیں؟ یا بالفاظ دیگر سیرتِ صدیقی کے عناصر ترکیبی کون کون سے ہیں؟ الحمد للہ کہ قرآن حکیم میں یہ موضوع ایک ہی مقام پر پورے شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو گیا ہے اور آخری پارے کی چھوٹی سورتوں میں سے ایک ہی سورت کا مطالعہ اگر بنظر غائر کر لیا جائے تو اس موضوع کے جملہ پہلو واضح ہو جاتے ہیں —— ہماری مراد سورۃ اللیل سے ہے!

اس سورۂ مبارکہ کے آخری حصے یعنی آیات ۱۷ تا ۲۱ کے بارے میں تو مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئیں —— چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَقَدْ ذَكَرَ غَيْرُ وَاحِدٍ مِنَ الْمُفَسِّرِيْنَ اَنَّ هٰذِهِ الْآيَاتِ نَزَلَتْ فِيْ اَبِيْ بَكْرِ الصِّدِّيْقِ، رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، حَتّٰى اِنَّ بَعْضَهُمْ حَكَى الْاِجْمَاعَ مِنَ الْمُفَسِّرِيْنَ عَلٰى ذٰلِكَ (تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر‘ تفسیر سورۃ اللیل)

’’متعدد مفسرین کے نزدیک یہ آیات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں

نازل ہوئی ہیں‘ یہاں تک کہ ان میں سے بعض کے نزدیک تو اس پر مفسرین کا اجماع ہے!‘‘

اس مضمون کی روایات بھی بکثرت موجود ہیں کہ آیات ۵ تا ۷ یعنی:

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝۵ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝۶ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝۷﴾

’’تو جس نے دیا اور پرہیزگاری اختیار کی‘ اور تصدیق کی اچھی بات کی‘ تو ہم اس کو آسانی سے پہنچا دیں گے (آخری اور کامل) آسانی میں!‘‘

کے مصداق بھی حضرت صدیق اکبر ہی ہیں‘ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ پوری سورت ہی مقام صدیقی کی وضاحت اور سیرتِ صدیقی کے عناصر ترکیبی کی تفصیل پر مشتمل ہے اور اس میں تصویر کا دوسرا رُخ صرف ضمنی طور پر اس قاعدہ کلیہ کے تحت دکھا دیا گیا ہے کہ ’’تُعْرَفُ الْاَشْيَاءُ بِاَضْدَادِهَا‘‘ یعنی کسی شے کی معرفت کے حصول کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ اس کے ضد اور مقابل کی معرفت حاصل کر لی جائے —— گویا یہ سورۂ مبارکہ اصلاً سورۂ صدیقیت ہے! اکابر مفسرین میں سے امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ اس حقیقت کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ سورۃ الضحیٰ کی تفسیر میں وہ ارشاد فرماتے ہیں:

سُوْرَةُ وَاللَّيْلِ سُوْرَةُ اَبِيْ بَكْرٍ وَسُوْرَةُ وَالضُّحٰى سُوْرَةُ مُحَمَّدٍ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ ثُمَّ مَا جَعَلَ بَيْنَهُمَا وَاسِطَةً لِيُعْلَمَ اَنَّهٗ لَا وَاسِطَةَ بَيْنَ مُحَمَّدٍ وَاَبِيْ بَكْرٍ (تفسیر کبیر‘ سورۃ الضحی)

’’سورۂ واللیل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سورت ہے اور سورۂ والضحیٰ نبی اکرم ﷺ کی سورت ہے اور (اللہ نے) ان دونوں کے مابین کوئی فصل نہیں رکھا تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ آنحضور ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مابین کوئی فصل نہیں ہے!‘‘

چہار سورۂ نور و ظلمت

قرآن حکیم کی سورتوں کے بارے میں یہ حقیقت تو خاصی معروف و معلوم ہے کہ

اکثر سورتیں دو دو کے جوڑوں کی صورت میں ہیں۔ گویا﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ﴾ (الذاریات:۴۹) کا قاعدۂ کلیہ قرآن حکیم کی سورتوں کے باب میں بھی جاری وساری ہے۔ بعض مقامات پر تو یہ حقیقت اتنی روشن وبین ہے کہ اندھوں کو بھی نظر آ جائے۔ بعض دوسرے مقامات پر تو قدرے خفی ومخفی ہے اور کسی قدر غور کرنے ہی سے واضح ہوتی ہے۔

سُورِ قرآنی کے بارے میں ایک خفی تر حقیقت جو گہرے غور وفکر سے سامنے آتی ہے، یہ ہے کہ بعض مقامات پر تین تین سورتوں کے گروپ ہیں، جن میں سے دو دو کی حیثیت تو ''زوجین'' ہی کی ہے، تیسری یا تو ان دونوں کے ضمیمے کی حیثیت رکھتی ہے یا وہ دونوں مل کر اس کا تتمہ بنتی ہیں (سورۂ یونس سے سورۂ نور تک گروپ کی تمام سورتوں کی ترتیب اسی طرز پر ہے!) اور بعض دوسرے مقامات پر دو دو متصل جوڑوں نے باہم مل کر نہایت حسین وجمیل 'چہار سوروں' کی صورت اختیار کر لی ہے۔ (قرآنِ مجید کا آخری پارہ تو ان 'چہار سوروں' سے تقریباً پر ہی ہے، طویل سورتوں میں بھی اس کی نہایت درخشاں مثالیں موجود ہیں، جیسے مثلاً سورۃ الفرقان سے سورۃ القصص تک اور سورۃ العنکبوت سے سورۃ السجدہ تک!)

آخری پارے کے ان 'چہار سوروں' میں سے ایک نہایت اعلیٰ وارفع اور حد درجہ حسین وجمیل چہار سورہ، سورۃ الشمس، سورۃ اللیل، سورۃ الضحیٰ اور سورۂ الم نشرح پر مشتمل ہے، جسے چہار سورۂ 'نور وظلمت' سے موسوم کیا جا سکتا ہے!

اس 'چہار سورے' کا پہلا جوڑا سورۃ الشمس اور سورۃ اللیل پر مشتمل ہے اور دوسرا سورۃ الضحیٰ اور الم نشرح پر۔ اور یہ حقیقت بادنیٰ تامل نظر آ جاتی ہے کہ جبکہ پہلی دونوں سورتیں مطالع اور عمود دونوں کے اعتبار سے مستقل اور مکمل سورتوں کی حیثیت رکھتی ہیں وہاں مؤخر الذکر جوڑے کی دوسری سورت پہلی کے ساتھ اس طرح مربوط اور مسلسل ہے کہ بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ کہ ایک ہی سورت کے اجزا ہوں (چنانچہ تابعین کرامؒ میں سے حضرت طاؤس اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہما اللہ کے بارے میں منقول ہے

کہ یہ دونوں حضرات سورۃ الضحیٰ اور سورۂ الم نشرح کو نماز کی ایک ہی رکعت میں بغیر کسی فصل کے پڑھتے تھے!) گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ چہار سورہ مضمون کے اعتبار سے تین اجزاء پر منقسم ہے، چنانچہ اس کا جزوِ اوّل سورۃ الشمس پر مشتمل ہے، جزوِ ثانی سورۃ اللیل پر اور جزو ثالث سورۃ الضحیٰ اور سورۂ الم نشرح پر! حاصل کلام یہ کہ اس 'چہار سورۂ نور وظلمت' میں سورۃ اللیل کو مرکزی اہمیت حاصل ہے!

ان تینوں اجزاء کے بارے میں ایک حقیقت تو اظہر من الشمس ہے، یعنی یہ کہ تینوں کا آغاز قسموں سے ہوتا ہے۔ ان قسموں میں اضداد کے جوڑوں کی شہادت قدرِ مشترک ہے اور ان اضداد میں سے بھی خصوصاً ایک جوڑا یعنی نور وظلمت تینوں میں مشترک ہے۔

ایک دوسری لطیف تر حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں اجزاء میں مُقسَم بہٖ تدریجاً سکڑتا اور سمٹتا چلا گیا ہے جبکہ مُقسَم علیہ ایک کلی کے مانند کھلتا وکھلتا اور تدریجاً ترقی کرتا چلا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ الشمس میں چار متضاد جوڑوں کی شہادت پیش کرنے کے بعد، جن میں سے تین آفاقی ہیں یعنی شمس وقمر، لیل ونہار اور ارض وسماء، اور ایک انفسی ہے یعنی امتیازِ فجور وتقویٰ، مقسم علیہ کو صرف دو جملوں میں سمیٹ لیا گیا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ﴿٩﴾ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ﴿١٠﴾﴾

یعنی کامیاب وکامران ہو گیا وہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا اور ناکام ونامراد اور خائب وخاسر رہ گیا وہ جس نے اپنے نفس ناطقہ کو اپنے وجودِ حیوانی کے تودۂ خاک میں دبا کر گویا زندہ درگور کر دیا۔

سورۃ اللیل میں شہادت میں صرف دو جوڑے پیش کیے گئے۔ ایک آفاقی یعنی رات اور اس کی ظلمت اور دن اور اس کی روشنی اور دوسرا انفسی یعنی تقسیم نر ومادہ۔ اور مقسم علیہ کو اولاً ایک آیت میں بیان کر کے یعنی ﴿اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ﴿٤﴾﴾ (یقیناً تمہاری سعی وجہد (کے نتائج) بھی مختلف ہیں!) اس کی مفصل تشریح وتوضیح چھ نہایت جامع آیات میں کر دی — یعنی ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ﴿٥﴾ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ﴿٦﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ﴿٧﴾﴾ جو گویا شرح وتفسیر ہے ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ﴿٩﴾﴾ کی — اور ﴿وَاَمَّا

مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ﴿۸﴾ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ﴿۹﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی ﴿۱۰﴾ ﴾ جو گویا تفسیر و تفصیل ہے: ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ﴿۱۰﴾﴾ کی۔

آخری جزو میں مقسم بہ تو مزید سمٹ گیا۔ چنانچہ سورۃ الضحیٰ میں اَضداد کے جوڑوں میں سے صرف ایک کی شہادت پیش کی گئی‘ یعنی دن اور اس کی روشنی اور سرگرمی اور رات اور اس کی تاریکی اور سکون‘ اور سورۂ الم نشرح کا آغاز بغیر کسی تمہیدی قسم کے ہو گیا (اگرچہ اس چہار سورے کے مجموعی مزاج کی مناسبت سے سورت کے درمیان میں ازواج متضادہ میں سے عُسر اور یُسر کا ذکر بتکرار کر دیا گیا) لیکن مقسم علیہ انتہائی بلندی کو پہنچ گیا۔ چنانچہ احوالِ نبوت کے بعض اہم گوشے اور ذاتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بعض حد درجہ نازک احساسات زیر بحث آئے اور ان کے ضمن میں تسلی بھی دی گئی‘ دلجوئی بھی کی گئی اور چند ہدایات بھی دی گئیں۔

حیرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود کہ قرآن مجید کی ان دو سورتوں سے امت کی ایک عظیم اکثریت کو ایک خصوصی قلبی لگاؤ ہے‘ اکثر لوگ ان کے معانی کے باب میں حد درجہ سطحی سے فہم پر قناعت کیے ہوئے ہیں‘ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں سورتوں کے مضامین نہایت رفیع و وقیع بھی ہیں اور حد درجہ غامض اور عمیق بھی! تاہم سردست یہ موضوع ہماری بحث سے خارج ہے اور مضمون زیر بحث کی مناسبت سے فی الحقیقت یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ اس ’چہار سورۂ نور و ظلمت‘ کے پہلے جزو میں ایک مضمون کا آغاز ہوتا ہے‘ دوسرے میں وہ انسانی کسب کے دائرے کی حد تک مکمل ہو جاتا ہے‘ اس لیے کہ تیسرے میں اس کے وہ پہلو بیان ہوئے ہیں جو مرتبۂ نبوت سے متعلق ہیں اور نبوت چونکہ خالص وہبی‘ ملکہ ہے‘ لہٰذا انسانی کسب کے دائرے سے باہر ہیں۔ ❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

گناہ کی حقیقت اور توبہ کی اہمیت

پروفیسر عبداللہ شاہین

احادیثِ رسول ﷺ کی مشہور کتاب ''صحیح مسلم'' کے باب ''سُقُوْطُ الذُّنُوْبِ بِالْاِسْتِغْفَارِ وَالتَّوْبَۃِ'' میں مندرج سیدنا ابوہریرہ اور سیدنا ابوایوب انصاری ؓ سے مروی ایک روایت یوں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَذَھَبَ اللّٰہُ بِکُمْ، وَلَجَاءَ بِقَوْمٍ یُذْنِبُوْنَ، فَیَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰہَ فَیَغْفِرُ لَھُمْ)) (رواہ مسلم)

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' اگر تم گناہ نہیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں نابود کر کے تمہاری جگہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جو گناہ کریں گے' پھر اللہ سے ان گناہوں کی بخشش طلب کریں گے' اور پھر ان کو معافی عطا کر دی جاتی رہے گی۔''

اس روایت کے مفہوم کو سمجھنا ایک نہایت نازک (sensitive) معاملہ ہے' اس لیے کہ ذرا سی غلط فہمی سے انسان گمراہی کے گڑھے میں گر سکتا ہے۔ آیئے! پہلے ''گناہ'' اور ''توبہ'' کی تعریف (definition) اور معانی کو سمجھیں:

گناہ: گناہ کے لیے قرآن مجید میں ''اِثْمٌ'' ۔ ''ذَنْبٌ'' ۔ ''مَعْصِیَۃٌ'' اور ''زَلَّۃٌ'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کے لغوی معانی تو قدرے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن مفہوم سب کا ایک ہی ہے' یعنی انسان کا اپنے رب کی اطاعت و تابع فرمانی میں کوتاہی کرنا' گناہ کہلاتا ہے۔

توبہ: ''تَوْبَۃٌ'' کے معنی پلٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ گناہ کے بعد بندے کا اپنے رب کے حضور ''توبہ'' کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ایک غلام اپنے آقا کا نافرمان بن کر اس سے منہ پھیر گیا اور بھاگ نکلا تھا۔ اب اپنے کیے پر پشیمان ہے اور اطاعت و تابع فرمانی کی طرف پلٹ آیا ہے۔

''گناہ'' اور ''توبہ'' کی تعریف (definition) جان لینے اور مذکورہ بالا حدیثِ رسول ﷺ

کے مطالعہ کے بعد ذہن میں سوال پیدا ہو سکتا ہے:

(ا) کیا اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ گناہ ہو؟ جواب آئے گا: ہرگز نہیں' کیونکہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَلَا یَرْضٰی لِعِبَادِہِ الْکُفْرَ ۚ﴾ (الزمر:۷) ''وہ اس بات پر راضی نہیں کہ اس کے بندے نافرمانی کی روش اختیار کریں۔''

(ب) تو بندوں کو گناہ کرنے کیوں دیے؟ کیا وہ اس پر قادر نہ تھا کہ انسان کو گناہ کرنے ہی نہ دیتا؟ تو تفصیلی جواب کے طور پر جانیے! کہ خالق کائنات نے انسان کی تخلیق متضاد قوتوں کے ساتھ فرمائی ہے' یعنی اس کو نیک و بد دونوں قسم کی قوتیں عطا کی ہیں —— وہ گناہ بھی کر سکتا ہے اور نیکی بھی —— وہ ارادۂ بد کا بھی حامل ہے اور ارادۂ خیر کا بھی۔

گویا لفظ ''انسان'' اور ''نسیان'' کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چنانچہ مادۂ بشریت سے متصف ہونے کی بنا پر سہو' نسیان اور لغزش کا امکان اس کی سرشت میں ہے' مگر فوراً ہی متنبہ ہو جانا اور اس سے کنارہ کشی اختیار کر لینا' یہ سنت انسانِ اوّل' آدم علیہ السلام ہے' جبکہ معصیت یعنی اللہ کی نافرمانی پر ڈٹے رہنا اور حکم باری تعالیٰ پر اکڑ جانا' یہ شیطان کا طریقہ قبیحہ ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو آدم علیہ السلام کے سامنے سجدۂ تعظیمی کرنے کا حکم دیا تو ﴿اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۳۴﴾﴾ (البقرۃ) ''اُس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا''۔ اب اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا: ﴿مَا مَنَعَکَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُکَ ؕ﴾ ''جب میں نے حکم دیا تو کس چیز نے تمہیں سجدہ کرنے سے روکا؟'' وہ حجت بازی کرتے ہوئے کہنے لگا: ﴿اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ ﴿۱۲﴾﴾ (الاعراف) ''میں اس سے بڑھ کر ہوں' مجھے تو نے آگ سے بنایا اور اسے تو نے خاک سے بنایا''—— اس تمرد اور سرکشی پر جب اللہ جل شانہ نے اسے اپنی بارگاہ سے نکل جانے اور مردود ہو جانے کی وعید سنائی تو استغفار و توبہ اور معافی تلافی کی درخواست کرنے کی بجائے قیامت تک مہلت (گناہ) مانگ لی۔ ﴿قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾﴾۔

دوسری طرف جبکہ انسانِ اوّل' آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ سے بھی جنت میں داخلہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا تَقْرَبَا ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ﴾ ''فلاں درخت کے قریب نہ جانا''، مگر شیطان کے بہکانے' پھسلانے سے انہوں نے اس درخت کا پھل کھا لیا۔ تب اللہ جل شانہ نے تنبیہ

کی: ﴿اَلَمۡ اَنۡهَكُمَا عَنۡ تِلۡكُمَا الشَّجَرَةِ﴾ ”کیا میں نے تمہیں فلاں درخت کے قریب پھٹکنے سے منع نہیں کیا تھا؟“ تو انہوں نے کوئی حیل وحجت نہیں کی۔ فوراً استغفار اور توبہ کرنے لگ گئے۔ یہ عاجزی اور تذلل اللہ تواب الرحیم کو اتنا پسند آیا کہ اپنے بندے کو توبہ واستغفار کے کلمات بھی القاء فرما دیئے‘ چنانچہ انہوں نے ﴿رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ٜ وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۲۳﴾﴾ (الاعراف) ”اے ربّ ہمارے! ہم (آدم وحوا) نے اپنی جانوں پر ظلم کرلیا‘ اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں ہوجائیں گے“ کہہ کر فوراً توبہ کر لی۔ پس ان کے مہربان ربّ نے ان کو قبولیت توبہ کی نوید جاں فزا یوں سنائی: ﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۳۷) ”پھر آدم نے اپنے ربّ سے کلمات (توبہ) سیکھ لیے‘ پس اُس (اللہ جلّ جلالہ) نے اس کی توبہ قبول فرمالی۔“

مذکورہ بالا قرآنی حوالے سے یہ رہنمائی ملی کہ شیطان کو تنبیہہ کی گئی تو وہ اپنے قصور کا اعتراف کرنے اور بندگی کی طرف پلٹ آنے کے بجائے ”نافرمانی“ پر جم گیا —— اس کے برعکس جب انسان کو اس کے قصور پر متنبہ کیا گیا تو اس نے سرکشی نہیں کی بلکہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ شرمندہ ونادم ہوا‘ اپنے قصور کا اعتراف کر کے ”اطاعت“ کی طرف پلٹ آیا اور اپنے رب سے معافی مانگ کر اُس کے دامن رحمت میں پناہ ڈھونڈی۔ بقول اقبال ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی‘ جو اماں ملی تو کہاں ملی!
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

اس طرح شیطان کی راہ اور وہ راہ جو انسان کو زیبا ہے‘ دونوں ایک دوسرے سے متمیز اور واضح ہوگئیں۔ یعنی شیطانی راہ یہ ہے کہ بندگیٔ رب سے منہ موڑے‘ اللہ جل شانہ کے مقابل سرکشی اختیار کرے اور متنبہ ہو جانے کے باوجود پورے استکبار اور اکڑ سے باغیانہ طرزِعمل پر اصرار کیے چلا جائے۔ بخلاف اس کے جو راہ انسان کو لائق ہے‘ وہ یہ ہے کہ ہر وقت چوکنا رہے۔ لیکن اگر کبھی اس کا قدم بندگی واطاعت کی راہ سے ہٹ جائے تو اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی ندامت وشرمساری کے ساتھ فوراً اپنے رب کی طرف پلٹے۔ بفرمانِ نبویؐ: ((اَلنَّدَمُ تَوۡبَةٌ)) (ابن ماجہ) ”ندامت ہی توبہ ہے“ اور بحوالہ آیتِ قرآنی:

﴿وَالَّذِيۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَةً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِهِمۡ ۚ وَمَنۡ يَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَلَمۡ يُصِرُّوۡا عَلٰى مَا فَعَلُوۡا وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾﴾ (آل عمران)

”وہ افراد کہ جب بے حیائی کا کوئی کام کر بیٹھتے ہیں یا اپنی جانوں پر ظلم کر لیتے ہیں تو اللہ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں‘ پھر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں‘ اور اللہ کے سوا گناہوں کو معاف کر بھی کون سکتا ہے! اور وہ لوگ باوجود علم کے کسی بُرے کام پر اڑ نہیں جاتے۔“

مختصر یہ کہ اگر چلتے چلتے گر پڑے ہو تو کوئی بات نہیں۔ اٹھو! کپڑے جھاڑو اور چل دو۔ بقولِ شاعر ع ٹھوکریں کھا کر تو گرتے ہیں‘ سنبھل جاتے ہیں لوگ! اور یہی انسانی شرف کا طُرّۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ جب سیدنا آدم علیہ السلام نے اسے اپنایا تو اللہ رؤف ورحیم کو ان کی یہ ادائے ندامت اس قدر پسند آئی کہ: ﴿ثُمَّ اجۡتَبٰهُ رَبُّهٗ﴾ (طٰہٰ:۱۲۲) —— خلافت کا منصب تو پہلے عطا کیا ہی تھا‘ اب پیغمبری بھی عنایت فرما دی اور نبوت کا تاج سر پہ سجا دیا۔

پھر یہی اسوۂ باوا آدمؑ دیگر انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی اختیار کیا۔ جیسے سیدنا نوح علیہ السلام کہ جب شفقت پدری کے جذبہ سے مجبور ہو کر ڈوبتے ہوئے بیٹے کے لیے سفارش کر دی تو فوراً تنبیہہ ربانی ہوئی:

﴿قَالَ يٰنُوۡحُ اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنِّىۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ﴿۴۶﴾﴾ (ھود)

”اللہ نے فرمایا کہ اے نوح! وہ تیرے اہل وعیال سے نہیں‘ کیونکہ اس کے اعمال درست نہیں‘ لہٰذا ایسی بات کا سوال نہ کرو جس کی حقیقت تمہیں معلوم نہیں‘ اور میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ نادان نہ بنو۔“

تو نوح علیہ السلام فوراً گڑگڑانے لگے اور عرض کیا:

﴿رَبِّ اِنِّىۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡـَٔلَكَ مَا لَيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ وَاِلَّا تَغۡفِرۡ لِىۡ وَتَرۡحَمۡنِىۡۤ اَكُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۴۷﴾﴾ (ھود)

”اے میرے رب! میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے ایسی بات کا سوال کروں جس کی حقیقت مجھے معلوم نہیں۔ اور اگر تو مجھے معاف نہ فرمائے گا اور مجھ پر رحم نہ کرے گا تو

میں بلاشبہ تباہ ہونے والوں میں جاؤں گا۔‘‘

تب رحمتِ ربانی منعطف ہوئی اور فرمایا:

﴿...... اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ ......﴾ (ھود:۴۸)

’’ہماری طرف سے سلامتی اور ان برکتوں کے ساتھ اترو جو تم پر ہیں......‘‘

اسی طرح سیدنا یونس علیہ السلام کے واقعہ کو لیجیے! جب وہ اپنی قوم کے رویہّ سے دل برداشتہ اور مایوس ہوکر اذنِ الٰہی کے بغیر بستی سے نکل کھڑے ہوئے اور کشتی میں سوار ہوگئے تو کشتی ڈانواں ڈول ہوگئی۔ اس پر قرعہ اندازی ہوئی کہ کس زائد مسافر کو سمندر کے حوالے کر دیا جائے تو یونس علیہ السلام کا نام نکلا۔ پس آپؑ کو پانی میں اتار دیا گیا‘ جہاں مچھلی نے باذنِ الٰہی آپؑ کو نگل لیا‘ مگر حکمِ باری تعالیٰ ہوا کہ نہ گوشت کھائے‘ نہ ہڈی توڑے۔ آپؑ کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور اعترافِ لغزش کے ساتھ بطور توبہ واستغفار‘ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ’’تیرے سوا کوئی معبود نہیں‘ تو پاک ہے‘ بلاشبہ میں ہی اپنے آپ پر زیادتی کرنے والا ہوں۔‘‘ کے الفاظ سے اللہ ارحم الراحمین کی تسبیح کا وِرد شروع کر دیا۔ حدیث رسول کے مطابق جب اللہ کے نبی یونس علیہ السلام نے دعا شروع کی تو ان کلمات نے عرشِ الٰہی کے گرد طواف شروع کر دیا۔ فرشتوں نے عرض کی: اے رب! یہ نحیف آواز جانی پہچانی معلوم ہوتی ہے۔ اللہ نے فرمایا: یہ میرے بندے یونس (علیہ السلام) کی آواز ہے۔ فرشتوں نے عرض کی: تیرا وہی بندہ جس کے اعمالِ صالحہ اور قبول ہونے والی دعائیں ہمیشہ آپ کے پاس پہنچتی رہی ہیں!...... نیز عرض کی: تو اس پر رحم فرما کر اسے نجات نہیں دے گا؟ اَللّٰہ الرحمٰن نے فرمایا: کیوں نہیں؟ چنانچہ سورۃ الانبیاء میں ہے:

﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ﴾ (الانبیاء:۸۸)

’’پس ہم نے اس کی دعا قبول کرلی اور اسے غم واندوہ سے نجات دے دی۔‘‘

بلکہ یہاں تک مہربانی فرمائی کہ:

﴿وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿١٤٧﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿١٤٨﴾﴾ (الصّٰفّٰت)

یعنی انہیں دوبارہ ان کی قوم کی طرف بھیجا‘ جو ایک لاکھ سے زائد نفوس پر مشتمل تھی‘ جو ان پر

ایمان لائی اور دنیاوی مہلت وسامانِ زندگی سے بہرہ مند ہوئی۔ چنانچہ سورۂ یونس میں ہے:

﴿لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٩٨﴾﴾

’’جب وہ لوگ ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے ذلت کا عذاب ٹال دیا اور دنیوی زندگی میں ایک وقت مقررہ تک انہیں فائدے اٹھانے دیے۔‘‘

مفسرین نے لکھا ہے:

’’قومِ یونسؑ نے جب عذاب کے آثار دیکھے تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلیا۔ اپنے بچوں‘ عورتوں‘ بوڑھوں حتیٰ کہ جانوروں اور مویشیوں کو بھی لیا اور بستی سے باہر آکر روتے اور گڑگڑاتے ہوئے فریاد کرنے لگے۔ اللہ‘ ارحم الراحمین نے رحم فرمایا‘ عذاب ہٹا دیا اور مہلت زندگی ومتاعِ دنیا عطا فرما دی۔‘‘

یہی رحمت ورأفت کا معاملہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے بھی ہوا۔ جب دو مَردوں کے درمیان لڑائی جھگڑے میں بیچ بچاؤ کراتے ہوئے اتفاقیہ طور پر ان کے ایک ہی مکّے کی ضرب سے ایک شخص موقع پر ہلاک ہوگیا تو فوراً عرض کی:

﴿رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ﴾

’’اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کرلیا پس تو مجھے بخش دے۔‘‘

رحمتِ باری نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور بلاتوقف صدائے اجابت جاری ہوئی:

﴿فَغَفَرَ لَهٗ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦﴾﴾ (القصص)

’’پس اسے معاف کر دیا‘ بے شک وہ (رب تعالیٰ) بڑا ہی بخشنے والا اور رحم والا ہے۔‘‘

نیز یہ معافی کی ادا اتنی پسند آئی کہ انہیں مدین میں ٹھکانہ عطا فرمایا‘ زوجہ کا بندوبست کیا اور پیغمبری عطا فرما کر واپس مصر بھی پہنچا دیا۔

اسی طرح جب اللہ کے نبی سیدنا داوٗد علیہ السلام سے منشائے ربانی کے علی الرغم کچھ سرزد ہوا‘ تو ان کا طرزِعمل قرآن حکیم میں بایں الفاظ بیان ہوا ہے:

﴿وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ﴿٢٤﴾﴾ (ص)

’’اور داوٗدؑ نے سمجھا کہ ہم نے اسے آزمائش میں ڈالا ہے تو اس نے اپنے رب سے مغفرت مانگی اور جھک کر گر پڑا اور (اللہ کی طرف) رجوع کیا۔‘‘

تو نوید آئی:

﴿فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿٢٥﴾﴾ (صٓ)

’’تو ہم نے اس کو بخش دیا‘ اور بے شک ہمارے ہاں اس کے لیے قرب اور عمدہ مقام ہے۔‘‘

کچھ ایسا ہی معاملہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کو درپیش ہوا۔ بقولہ تعالیٰ: ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ﴾ (صٓ: ۳۴) ’’اور ہم نے سلیمانؑ کو مبتلائے آزمائش کیا‘‘۔ تو سلیمان علیہ السلام نے عرض گزاری: ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ ......﴾ (صٓ: ۳۵) ’’اے رب مجھے معاف کر دے!‘‘ تو اللہ الرحمٰن نے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ انسانوں‘ جنوں‘ ہواؤں‘ فضاؤں‘ میدانوں‘ پہاڑوں غرضیکہ ہر چیز پر ایسی بادشاہت عطا فرمائی کہ کبھی کسی دوسرے کو ایسی بادشاہت وسلطنت عنایت نہیں ہوئی اور سب سے بڑھ کر یہ عطائے بے پایاں ملی کہ:

﴿وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿٢٥﴾﴾ (صٓ)

’’اور بے شک اس کے لیے ہمارے ہاں قُرب اور مقامِ استحسان ہے۔‘‘

بقول اقبال : ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

غرضیکہ بندگی رب میں پلٹنا بہت ہی پسندیدہ عمل ہے‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا ہی اپنی عبادت کے لیے کیا ہے۔

عبادت کسے کہتے ہیں؟

’’عبادت‘‘ کہتے ہیں ’’تذلّل‘‘ کو‘ جس کا مفہوم ہے وہ روندا ہوا رستہ جو سب کے نیچے بچھا دیا جائے‘ یا وہ عاجز اونٹ کہ بچہ بھی چاہے تو نکیل سے پکڑ کر جدھر چاہے لے جائے۔ پھر ’’تذلّل‘‘ کے چار درجے ہیں:

(۱) محتاجی کا تذلّل (تَذَلُّلُ الْفَقْرِ فِي الدَّارَيْنِ): ہر شے اللہ کی محتاج ہے۔ چرند‘ پرند‘ درند‘ جن وانس (مؤمن وکافر‘ فاسق وفاجر) کوئی آکسیجن کا محتاج‘ کوئی دھوپ کا‘ کوئی پانی کا‘ کوئی روٹی‘ کپڑے اور مکان کا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ﴾ (فاطر: ۱۵)

’’اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو۔‘‘

یعنی ساری کائنات ہی اللہ کے سامنے ذلیل اور محتاج ہے۔

(۲) اطاعت کا تذلّل: یعنی اوامر ونواہی پر عمل کرنا‘ جیسے مراسمِ عبودیت نماز‘ روزہ‘ حج‘ زکوٰۃ‘ جنہیں ارکانِ اسلام بھی کہا جاتا ہے۔

(۳) محبت کا تذلّل: یعنی مارے باندھے کی اطاعت نہیں بلکہ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۶۵) ’’اہل ایمان تو سب سے زیادہ محبت اللہ سے کرتے ہیں‘‘ کے مصداق اطاعت کے ساتھ محبت کا جذبہ بھی شامل ہو۔ وگرنہ خالی خولی اطاعت تو دنیوی حکمرانوں کی بھی کی جاتی ہے۔ مگر تذلّل کے ساتھ اطاعت کرنے والے مالک الملک کو حاکم ہی نہیں‘ محبوب بھی مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک: لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰهُ، لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰهُ، لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ، لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ!

(۴) گناہ کا تذلّل (تَذَلُّلُ الْمَعْصِيَةِ): یعنی بندے کے دامن پر گناہ کا داغ لگ گیا۔ اب وہ محبّ نہیں‘ مجرم ہے۔ روسیاہ ہو گیا۔ پس کس منہ سے ربّ تعالیٰ کا سامنا کرے گا؟ یہ ذلت جو گناہ سے ہوتی ہے‘ ویسے نہیں ہوتی۔ اب جو عاجزی گناہگار میں پیدا ہو گی وہ ربّ کو بہت پیاری لگتی ہے۔ بقولہٖ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ ’’تائب‘‘ کو اپنا بندہ ہی نہیں‘ محبوب بھی بنا لیتا ہے‘ کیونکہ گناہ سے نہ صرف نگاہِ الٰہی بلکہ اپنی نظروں میں بھی ذلیل ہو گیا۔ گویا گناہ کا سرزد ہو جانا ’مُغْتَنَمْ‘ لیکن ارادتاً کرنا نہیں۔ ہو جائے تو فوراً طلب مغفرت اور آئندہ کے لیے توبہ۔ یعنی کبھی ایسا نہ کرنے کا پختہ عہد۔ پھر خیر ہی خیر ہے۔ کیونکہ نیکوکار کی اکڑ سے گناہگار کا شرمندہ ہونا‘ اللہ کو زیادہ پسند ہے۔ جو مقامِ عبودیت‘ گناہ پر نادم ہونے سے ملتا ہے‘ وہ نیکی سے بھی نہیں‘ بشرطیکہ گناہ نادانستہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ ’’سو سو گناہ کیے تیری رحمت کے زور پر‘‘ کا دھوکہ کھائے بیٹھا ہو —— چنانچہ توبہ کے بعد جو اعلیٰ درجہ ومرتبہ ملے گا‘ وہ اس سے قبل نہیں —— صرف: ؎

رحمت یہ چاہتی ہے کہ اپنی زبان سے
کہہ دے گناہگار کہ تقصیر ہو گئی!

یعنی آدمی اپنے کیے پر صدقِ دل سے نادم ہو۔ جس برائی کا وہ مرتکب ہوا ہے یا ہوتا رہا ہے‘ اس

سے رک جائے اور آئندہ اس کا ارتکاب نہ کرے۔ نیز جو برائی کسی شخص سے کی تھی اس کی تلافی کرے اور کفارۂ گناہ کے لیے زیادہ سے زیادہ نیکیاں کر کے اس دھبے کو صاف کرے جو اس نے اپنے دامن پر لگا لیا تھا۔ پس رحمت باری تعالیٰ کا اعلان ہے:

﴿اِلَّا مَنۡ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسۡنًۢا بَعۡدَ سُوۡٓءٍ فَاِنِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ﴿۱۱﴾﴾ (النمل)

''لیکن جس نے گناہ کیا پھر بدی کے بعد نیکی بھی کر لی تو یقیناً میں بہت ہی بخشنے والا' رحم کرنے والا ہوں۔''

اور یہ کہ:

﴿اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ؕ﴾ (ھود:۱۱۴)

''یقیناً نیکیاں' برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد:

﴿وَرَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ ؕ﴾ (الاعراف:۱۵۶)

''اور میری رحمت ہر چیز پر چھا گئی ہے۔''

کے تحت رحمتِ ربانی کا یہاں تک احسان ہے کہ:

﴿اِلَّا مَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمۡ حَسَنٰتٍ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا﴿۷۰﴾﴾ (الفرقان)

''سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کریں اور ایمان لائیں اور نیک کام کریں' تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ (نہ صرف معاف کر دیتا ہے بلکہ) نیکیوں سے بدل دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تو ہے ہی انتہائی بخشش والا' رحم فرمانے والا۔''

کیا انسان اس فضل الٰہی سے بڑا فضل بھی کوئی دیکھ سکتا ہے؟ اور یہی نہیں' بلکہ اگر ترکِ گناہ کے بعد بھی گناہ سرزد ہوتا رہے تو ہر بار معافی کی قبولیت کا مژدہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((اِنَّ عَبۡدًا اَذۡنَبَ ذَنۡبًا، فَقَالَ: رَبِّ اَذۡنَبۡتُ فَاغۡفِرۡلِیۡ، فَقَالَ رَبُّہٗ: اَعَلِمَ عَبۡدِیۡ اَنَّ لَہٗ رَبًّا یَغۡفِرُ الذَّنۡبَ وَیَاۡخُذُ بِہٖ، غَفَرۡتُ لِعَبۡدِیۡ ، ثُمَّ مَکَثَ مَا شَاءَ اللّٰہُ، ثُمَّ اَذۡنَبَ ذَنۡبًا، فَقَالَ: رَبِّ اَذۡنَبۡتُ فَاغۡفِرۡہُ ، فَقَالَ: أَعَلِمَ عَبۡدِیۡ اَنَّ لَہٗ رَبًّا یَغۡفِرُ الذَّنۡبَ وَیَاۡخُذُ بِہٖ، غَفَرۡتُ لِعَبۡدِیۡ، ثُمَّ مَکَثَ مَا شَاءَ اللّٰہُ، ثُمَّ اَذۡنَبَ

ذَنۡبًا، قَالَ: رَبِّ اَذۡنَبۡتُ آخَرَ فَاغۡفِرۡہُ لِیۡ، فَقَالَ: أَعَلِمَ عَبۡدِیۡ اَنَّ لَہٗ رَبًّا یَغۡفِرُ الذَّنۡبَ وَیَاۡخُذُ بِہٖ، غَفَرۡتُ لِعَبۡدِیۡ ثَلَاثًا، فَلۡیَعۡمَلۡ مَا شَاءَ)) (رواہ البخاری)

''ایک شخص نے گناہ کیا۔ پھر کہنے لگا: پروردگار! مجھ سے گناہ ہو گیا ہے' پس تو مجھے معاف فرما دے۔ تو اُس کے رب نے فرمایا: کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے' جو چاہے تو گناہ معاف کر دے اور چاہے تو اس پر پکڑ لے۔ پس میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا۔ پھر وقت گزرا جتنا کہ اللہ نے چاہا' پھر وہ گناہ کر بیٹھا۔ اُس نے پھر وہی کہا: پروردگار! مجھ سے گناہ ہو گیا ہے' پس تو مجھے معاف فرما دے۔ تو پھر وہی ارشاد باری تعالیٰ ہوا: کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے' جو چاہے تو گناہ معاف کر دے اور چاہے تو اس پر پکڑ لے۔ پس میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا۔ پھر ایک عرصہ گزرا جتنا کہ اللہ نے چاہا' پھر اس سے گناہ ہو گیا۔ وہ کہنے لگا: پروردگار! میں نے تو پھر ایک اور گناہ کر دیا' پس مجھے بخش دے۔ اللہ تعالیٰ نے پھر فرمایا: کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے (جسے وہ پکار رہا ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ اسے اختیار حاصل ہے کہ) چاہے تو بخش دے اور چاہے تو پکڑ لے۔ پس میں نے اپنے بندے کو تینوں دفعہ معاف کر دیا۔ بس وہ اب جو چاہے کرے (چاہے بار بار ایسا کرے)۔''

واضح ہو کہ قرآن وحدیث میں ایسے لوگوں کے لیے ''اَلتَّآئِبُوۡنَ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''توبہ'' اہلِ ایمان کی مستقل صفات میں سے ہے' جس کا صحیح مفہوم ''ایک ہی مرتبہ توبہ کرنا'' نہیں ہے بلکہ بار بار' جب بھی توبہ ٹوٹے' ہمیشہ صدقِ دل سے توبہ کرتے رہنا ہے۔ توبہ کا اصل معنی رجوع کرنا ہے' لہٰذا اس لفظ کی حقیقی روح ''اللہ کی طرف بار بار پلٹنا'' ہے۔ مؤمن اگرچہ اپنے شعور اور ارادے کے ساتھ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتا بلکہ بتقاضائے بشریت ایسا ہو جانے کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے' چنانچہ ایک حقیقی مؤمن کی صفت یہ ہے کہ جب بھی اس سے بھول چوک ہوتی ہے وہ اپنی غفلت سے چونکتا ہے اور اسے ندامت لاحق ہوتی ہے' شرمندگی کے ساتھ اپنے رب کی طرف پلٹتا ہے' معافی مانگتا ہے اور پھر سے اپنے عہد بندگی کو تازہ کر لیتا ہے۔

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں

یہی بار بار کی توبہ اور باری تعالیٰ کی طرف پلٹنا اور ہر لغزش کے بعد بندگی و اطاعت کی راہ پر واپس آ جانا‘ ایمان کے دوام و ثبات کا ضامن ہے۔ وگرنہ انسان جن بشری کمزوریوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے ان کی موجودگی میں کون دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ گناہگار نہیں۔ بقول شاعر ؎

جے میں ویکھاں عملاں ولے تے کجھ نئیں میرے پلّے
جے میں ویکھاں رحمت رب دی تے بلّے بلّے بلّے

اللہ تعالیٰ اس قدر رحیم و کریم ہے کہ فرماتا ہے: ﴿مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ﴾ (النساء:۱۴۷) ’’اللہ تمہیں سزا دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر گزاری کرتے رہو اور باایمان رہو!‘‘ بلکہ اس کی رحمت ﴿وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ﴾ ہے۔ پس خواہ تم کتنے ہی قصور کرلو‘ جب بھی اپنے افعالِ قبیحہ پر شرمسار اور نادم ہو کر اس کے حضور توبہ کرو گے‘ اس کے دامنِ رحمت کو اپنے لیے وسیع پاؤ گے۔ کیونکہ وہ ’’الْوَدُوْد‘‘ ہے۔ ’’الْحَنَّان‘‘ اور ’’الْمَنَّان‘‘ ہے۔ مزید برآں یہ کہ اللہ احکم الحاکمین نے اپنے بندوں کو دعوت دی ہے:

﴿وَتُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا اَیُّہَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾﴾ (النور)

’’اے (خطاکار) مؤمنو! تم سب اللہ کے سامنے پکی سچی توبہ کرو‘ تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔‘‘

نیز توبہ کے لیے مہلت بھی عطا فرمائی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ صَاحِبَ الشِّمَالِ لَیَرْفَعُ الْقَلَمَ سِتَّ سَاعَاتٍ عَنِ الْعَبْدِ الْمُسْلِمِ الْمُخْطِئِ، فَاِنْ نَدِمَ وَاسْتَغْفَرَ اللّٰہَ مِنْھَا اَلْقَاھَا، وَاِلَّا کُتِبَتْ وَاحِدَۃٌ))

(جامع الصغیر)

’’بائیں طرف والا فرشتہ (یعنی برائیاں لکھنے والا فرشتہ) خطا کرنے والے مسلمان بندے سے چھ گھنٹے تک قلم کو روکے رکھتا ہے (کہ توبہ کرلے) پھر اگر وہ بندہ شرمندہ ہو کر اللہ سے معافی مانگ لیتا ہے تو برائی نہیں لکھتا‘ ورنہ ایک برائی لکھ لی جاتی ہے۔‘‘

پس بفحوائے عبارت حدیث:

((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَہٗ)) (ابن ماجہ)

’’گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے جیسا اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔‘‘

اور اگر توبہ ٹوٹ بھی جائے تو گھبرانے کی بات نہیں‘ کیونکہ یہ فرمانِ نبویؐ:

((کُلُّ بَنِیْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ)) (ترمذی)

’’تمام اولادِ آدم خطاکار ہے اور خطاکاروں میں وہ بہترین لوگ ہیں جو بار بار توبہ کرنے والے ہیں۔‘‘

بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((...... اَیُّ عَبْدٍ لَّکَ لَا اَلَمَّا)) (ترمذی)

یعنی کون سا بندہ ہے جس سے (گناہِ صغیرہ) خطائیں نہ سرزد ہوتی ہوں؟ لہٰذا ((اِنْ عَادَ فِی الْیَوْمِ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً)) (ترمذی‘ ابوداؤد) اگر دن میں ستر مرتبہ بھی توبہ ٹوٹ جائے تو کوئی بات نہیں۔ کیونکہ حدیث قدسی میں اعلانِ باری تعالیٰ ہے:

((یَا ابْنَ اٰدَمَ اِنَّکَ مَا دَعَوْتَنِیْ وَرَجَوْتَنِیْ غَفَرْتُ لَکَ مَا کَانَ فِیْکَ وَلَا اُبَالِیْ......)) (ترمذی)

’’اے آدم کے بیٹے! جب تک تو مجھ سے امید لگا کر مجھے پکارتا رہے گا میں تجھے معاف کرتا رہوں گا اور مجھے کوئی پروا نہیں۔‘‘

بلکہ فرمانِ نبویؐ ہے:

((اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ الْمُفْتَنَّ التَّوَّابَ)) (احمد‘ بیہقی)

یعنی جو بندہ کثرت سے گناہوں میں ملوث ہو جاتا ہو‘ مگر اسی کثرت سے بار بار توبہ کرنے والا ہو‘ تو اللہ کو اس پر پیار آ جاتا ہے۔ بقول شاعر ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ!

’’رک جا‘ رک جا‘ گناہوں سے اگرچہ تو کافر‘ آگ کا پوجنے والا‘ قبر پرست یا بت پرست بھی ہے۔ یہ میری بارگاہ مایوسی کی بارگاہ نہیں ہے‘ اگر تیری توبہ سو بار بھی ٹوٹ جائے پھر بھی باز آ!‘‘

اللہ عزوجل تو اتنا غفور و رحیم ہے کہ:

((اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ یَبْسُطُ یَدَہٗ بِاللَّیْلِ لِیَتُوْبَ مُسِیْءُ النَّھَارِ وَیَبْسُطُ یَدَہٗ بِالنَّھَارِ لِیَتُوْبَ مُسِیْءُ اللَّیْلِ، حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِھَا)) (رواہ مسلم)

’’اللہ تعالیٰ اپنا دستِ شفقت رات کو دراز کرتا ہے کہ دن بھر خطائیں کرنے والا توبہ کر لے‘ اور اپنا دستِ رأفت دن کو دراز کرتا ہے کہ رات کی تاریکیوں‘ تنہائیوں اور پنہائیوں میں گناہ کرنے والا توبہ کر لے۔ (اور توبہ کی قبولیت کا یہ رحمانی و ربانی سلوک مسلسل جاری رہے گا) یہاں تک کہ سورج (قیامت کی بڑی نشانی کے طور پر مشرق کی بجائے) مغرب کی طرف سے طلوع ہو جائے۔‘‘

توبہ کی خصوصی دعوت کا وقت وہ ہے جسے تہجد کا وقت کہتے ہیں جب ’’سحری کی کچہری‘‘ آسمانِ دنیا پر لگتی اور سجتی ہے —— اور ترغیب و تشویق ہوتی ہے کہ ’اس وقت آ جاؤ! جھولیاں بھر دوں گا۔ جب ﴿بَلْ یَدٰہُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ (المائدۃ:٦٤) کی شان کے ساتھ شہنشاہِ ارض و سماء دونوں ہاتھوں سے رحمتیں لنڈھا رہا ہوتا ہے۔ بحوالہ حدیث:

((یَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَکَ وَتَعَالٰی کُلَّ لَیْلَۃٍ اِلَی السَّمَاءِ الدُّنْیَا حِیْنَ یَبْقٰی ثُلُثُ اللَّیْلِ الْآخِرُ یَقُوْلُ: مَنْ یَدْعُوْنِی فَاَسْتَجِیْبَ لَہٗ، مَنْ یَسْاَلُنِی فَاُعْطِیَہٗ، مَنْ یَسْتَغْفِرُنِیْ فَاَغْفِرَلَہٗ؟ [حَتّٰی یَنْفَجِرَ الْفَجْرُ])) (متفق علیہ)

’’ہمارا رب تبارک و تعالیٰ ہر رات آسمانِ دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے‘ جب رات کا تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے فرمان جاری ہوتا ہے: (۱) ہے کوئی جو مجھے پکارے‘ میں اس کی دعا قبول کروں؟ (۲) ہے جو کوئی مجھ سے مانگے میں اسے عطا کروں؟ (۳) ہے کوئی جو مجھ سے معافی مانگے‘ میں اس کے گناہ بخش دوں؟ [یہ سلسلہ طلوعِ فجر تک جاری رہتا ہے۔]‘‘

بقول شاعر ؎

تو وہ ’’داتا‘‘ ہے کہ سیری نہیں ہے دینے میں
لذّتِ جود سے ’’پھر مانگ‘‘ سکھایا مجھ کو

مخلوق کی فطرت یہ ہے کہ بڑے سے بڑا سخی بھی ہو تو سوالی کو دیکھ کر کبھی نہ کبھی ماتھے پر بل پڑ جائے‘ مگر اللہ کی صفت یہ ہے کہ اس سے مانگو تو وہ خوش ہوتا ہے‘ اور نہ مانگو تو ناراض ہوتا ہے۔ (الحدیث) الغرض گناہ سرزد ہو جانا‘ سرشت آدمیت ہے‘ لیکن ؎

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارا نہ کیا
پر تو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا

ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر
لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا!

کہہ کر بندہ اللہ کی نافرمانیوں اور گناہوں پر دیدہ دلیر نہ ہو جائے۔ بلکہ صدقِ دل سے توبہ کرے‘ جس کی شرائط امام نووی ؒ نے اپنی کتاب ’’ریاض الصالحین‘‘ میں یہ لکھی ہیں:

’’اگر گناہ کا تعلق بندے اور اللہ کے مابین ہے تو اس کے لیے تین شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ گناہ سے باز آئے‘ دوسری یہ کہ وہ گناہ پر شرمسار ہو اور تیسری یہ کہ وہ عزم کر لے کہ پھر کبھی اس گناہ میں مبتلا نہ ہوگا۔ اگر گناہ کا تعلق کسی آدمی (یعنی حقوق العباد) کے ساتھ ہے تو چوتھی شرط یہ ہے کہ متعلقہ بندے کا حق ادا کر کے یا معاف کرا کے خود کو اس کے حق سے ’’بری‘‘ کروائے۔‘‘

اسی طرح عالمِ عرب کے معروف عالم محمد صالح المنجد نے اپنے کتابچہ ’’اُرِیْدُ اَنْ اَتُوْبَ وَلٰکِنْ؟ جس کا ترجمہ ’’میں توبہ کرنا تو چاہتا ہوں —— لیکن؟‘‘ کے عنوان سے دستیاب ہے اور اس کا مطالعہ انتہائی مفید ہے‘ اس میں لکھا ہے:

’’توبہ کا کلمہ بڑا عظیم ہے جس کے مدلولات بہت گہرے ہیں۔ ایسے نہیں جیسے اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ زبان سے ’’توبہ‘‘ کا لفظ کہہ دیا اور گناہ بھی کرتے رہے۔ (امام حسن بصریؒ کا قول ہے جو زبان سے توبہ‘ توبہ کہتا رہا اور گناہ ترک نہ کیا‘ اس نے رب سے ٹھٹھہ کیا‘ اسے دگنا عذاب ہوگا۔ مؤلف) بلکہ توبہ کرنے والے کے لیے ندامت‘ گزشتہ کاموں پر افسوس اور نافرمانی کی خواہش کو کلیتاً ترک کرنا بھی ضروری ہے۔ اور ترکِ گناہ بھی محض اللہ کی خاطر ہو‘ کوئی اور سبب نہ ہو‘ جیسے لوگوں کی ملامت سے ڈرنا‘ چور کا سپاہی سے ڈرنا‘ رشوت خور کا محکمہ انسدادِ رشوت سے ڈرنا —— یا گناہ اور نافرمانی کے قابل ہی نہ رہنا‘ مثلاً چور کا تالا نہ توڑ سکنا یا زانی کا جماع کی طاقت سے ہی عاری ہو جانا‘ وغیرہ۔‘‘

مزید لکھتے ہیں:

’’کبھی آپ یوں کہتے ہیں کہ جب مجھ سے گناہ سرزد ہو تو پھر میں اس سے توبہ کیسے کروں؟ —— اور کبھی آپ یہ کہتے ہیں کہ میں تو توبہ کرنا چاہتا ہوں‘ لیکن —— میرے برے دوست ہر طرف سے مجھ پر حملہ آور ہوتے ہیں (تاکہ پھر گناہوں میں ملوث کر دیں)۔ جواب: ...... توبہ کرنے والا جلد از جلد توبہ کی طرف متوجہ ہو کیونکہ توبہ کرنے میں دیر کرنا بذاتِ خود ایک گناہ ہے ...... لہٰذا اس (فوری توبہ) کے بعد نیکی اور اطاعت

کے کام بکثرت کرنا چاہئیں...... نافرمانی والی جگہ کو چھوڑ دے (تاکہ دوبارہ نافرمانی میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ رہے) اور جو دوست معصیت کے کاموں میں اعانت کرتے تھے' انہیں بھی چھوڑ دے کہ ماضی کے دوستوں سے تعلقات کی بنا پر کئی لوگ پھر سے گناہ میں جا پڑے' اسی لیے قیامت کے دن برے ہم نشین ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔ لہٰذا اے تائب! اب جب آپ اس راہ پر چل نکلے ہیں تو پھر ثابت قدم رہیے۔ بُرے دوستوں کے بجائے نیک دوست انتخاب کریں جو توبہ کی استقامت پر مددگار ہوں۔ علمی مجالس اور ذکر کے حلقوں میں شامل ہوں—— اگر نشہ آور اشیاء' آلاتِ موسیقی' فحش افسانے' ناول' فلمیں' ڈرامے اور تصویریں موجود ہوں تو جلا دیجیے! تاکہ ہدایت کے بعد گمراہی کا سبب نہ بنیں...... کچھ عجب نہیں کہ بعض ماضی کی سہیلیوں (girl friends) میں سے کسی کا ٹیلی فون آ جائے یا برے دوستوں میں سے کسی کی دھمکی آئے کہ میں نے تیرے مکالمے ریکارڈ کر رکھے ہیں' تیرے فوٹو میرے پاس ہیں' ہم تجھے رسوا کر دیں گے' تو پروا نہ کرو کہ حقیقی رسوائی تو وہ ہے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے اور تمام مخلوقات جن وانس اور فرشتوں کی موجودگی میں ہوگی۔ پس اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی مدافعت کے لیے کافی ہے۔ اور اگر بالفرض بعض باتیں کھل جائیں تو بتلا دیجیے کہ میں اللہ کے حضور توبہ کر چکا ہوں۔ اگر کسی کی غیبت' چغلی یا تہمت کا مرتکب ہوا تھا تو اس کے سامنے اعترافِ گناہ ضروری نہیں کہ اس سے اصلاح کی بجائے دشمنی پیدا ہونے اور فتنہ وفساد کا اندیشہ ہے۔ البتہ جن مجالس میں اس کی غیبت کی تھی' انہیں مجالس میں اس کی تعریف کرے اور اگر کوئی اس شخص کی عیب چینی کی کوشش کرے تو اس کی مدافعت کرے۔ نیز متعلقہ شخص کے لیے کثرت سے استغفار کیا کرے کہ غیبت وچغلی کا کفارہ بن جائے اور معافی تلافی کا سبب ہو۔'' (المنجد)

جہاں تک دوسروں کے مالی حقوق کا تعلق ہے تو ضرور ادا کرے' یعنی قرض' رشوت کا مال یا غصب کی ہوئی جائیداد وغیرہ واپس کرے۔ اس سے انہیں خوشی ہوگی اور دوستی وخیر سگالی کے جذبات پیدا ہوں گے—— اگر ''قتلِ عمد'' کا مجرم ہے یعنی اتفاقاً نہیں بلکہ جان بوجھ کر اور ارادتاً (target killing) کسی کو قتل کیا ہے تو اللہ جل جلالہ کے سامنے توبہ کرنے کے علاوہ اپنی جان مقتول کے وارثوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے حوالے کرے تاکہ ورثاء اِس سے قصاص لیں (یعنی جان کے بدلے جان لیں) اور ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ (باقی صفحہ 98 پر)

اہلِ ایمان اور رسول اللہ ﷺ سے محبت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اہلِ ایمان کے لیے رسول اللہ ﷺ سے محبت ایمان کا جزو لازم ہے جس کے بغیر کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا۔ دنیا میں رہتے ہوئے مؤمن کی سب سے زیادہ محبت تو اللہ تعالیٰ سے ہے کہ اس نے وجود بخشا اور رسول اللہ ﷺ کو اپنا کلام دے کر بھیجا کہ وہ جمیع انسانوں کو ہدایت کا راستہ دکھائیں‘ جس کے نتیجے میں وہ موت کے بعد کی زندگی میں سدا بہار نعمتوں میں رہیں اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچ سکیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت ہے کہ ان کی وجہ سے لوگوں کو ایمان نصیب ہوا اور زندگی گزارنے کا وہ انداز ملا جو حقیقی کامیابی کے لیے لابدی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس احسان کا تقاضا ہے کہ ان کے ساتھ محبت رکھی جائے۔ اگر وہ واسطہ نہ بنتے تو لوگ مؤمن نہ ہوتے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آپ ﷺ کے ساتھ محبت کو تمام دوسری محبتوں سے فائق رکھا گیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۴﴾ (التوبۃ)

’’(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور برادری اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے مندا ہونے سے تم ڈرتے ہو اور رہائش گاہیں جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو زیادہ محبوب ہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم (یعنی سزا نافذ کر دے)۔ اور اللہ ایسے نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتا۔‘‘

اس آیت میں آٹھ چیزوں کی محبت کا ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی محبت ان سب سے

زیادہ ہونی چاہیے۔ یہ چیزیں وہ ہیں کہ ان کی محبت انسان کی فطرت میں رچی بسی ہے۔ انسان کو فطری تقاضوں کے پورا کرنے سے روکا نہیں گیا البتہ ان کی ادائیگی کا سلیقہ سکھایا گیا ہے۔ والدین کے ساتھ محبت کے جذبے سے ان کی خدمت کرنا‘ ان کے ساتھ بھلائی کرنا‘ ان کا ادب واحترام کرنا اور کسی طرح سے ان کو پریشان نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے نہ عمل سے نہ گفتگو سے۔ اللہ نے فرمایا: ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ (البقرۃ:۸۳)۔ اسی طرح عزیز و اقارب کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ غرض سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ میں مذکورہ آٹھ چیزوں کے ساتھ محبت سے روکا نہیں گیا‘ البتہ یہ بتا دیا گیا کہ ان سب سے بڑھ کر محبت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہونی چاہیے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ)) (صحيح البخاری)

’’اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے‘ تم میں سے کوئی ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اُسے اس کے باپ‘ بیٹے اور سارے انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔‘‘

آپ ﷺ تو عظمت کے اس مقام پر ہیں کہ آپؐ قسم نہ بھی کھائیں تب بھی آپؐ کی ہر بات حد درجہ سچی ہے‘ لیکن جب آپؐ قسم کھا کر کوئی بات کہیں تو وہ بات کتنی زیادہ پختہ اور محکم ہوگی۔ گویا ایمان کی صحت کے لیے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہر چیز سے زیادہ محبت اولین تقاضا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آپؐ کے ساتھ محبت اس آیت کا کامل مصداق تھی۔ ایک وقت تھا کہ عمر بن الخطاب ایمان سے محروم تھے اور رسول اللہ ﷺ کے خون کے پیاسے تھے‘ لیکن جب ایمان لا کر صحابیت کا شرف پایا تو ان کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہوگئی۔ حضرت عبداللہ بن ہشامؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے‘ آپؐ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ حضرت عمر نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یقیناً آپؐ مجھے میری جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔ آپؐ نے اللہ کی قسم کھا کر کہا: ’’نہیں۔ اُس وقت تک جب تک میں تجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں‘‘۔ حضرت عمرؓ نے ایک لحظہ تامل کیا اور کہا: اللہ کی قسم! یقیناً اب آپؐ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اے عمر اب بات بنی ہے۔‘‘ (صحیح بخاری)

یہ قرآن وحدیث کا اٹل فیصلہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حد درجہ محبت ایمان کی نشانی ہے اور اس کے بغیر مؤمن کا ایمان کامل نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ نے آپؐ کے ساتھ محبت کا عملی ثبوت دیا۔ وہ ہر آن آپؐ کے اشارے کے منتظر رہتے تھے‘ جبھی آپؐ نے حکم دیا تبھی اس کی تعمیل کی گئی۔ وہ ہمہ وقت آپؐ کے دیدار کے شائق تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر رہیں۔ جب آپؐ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے تو انصار کے جوان اور بوڑھے سب آپؐ کے استقبال کے لیے چشم براہ تھے۔ غرض آپؐ نے مدینہ میں قیام کیا۔ ایک دفعہ باتوں باتوں میں انصارِ مدینہ کو اس بات کی فکر ہوئی کہ آپؐ کبھی مدینہ سے چلے نہ جائیں۔ چنانچہ ان کی اس پریشانی پر آپؐ نے ان کو اطمینان دلایا اور فرمایا جب تک زندگی ہے تمہارے ساتھ بسر کروں گا اور مرنا بھی ہے تو تمہارے شہر میں۔ آپ ﷺ کے دیدار کے شوق کا یہ حال تھا کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ! بلاشبہ آپؐ مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ آپؐ مجھے میرے بیٹے سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ گھر بیٹھے آپ کی یاد آتی ہے تو مجھے اس وقت تک چین نصیب نہیں ہوتا جب تک آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر آپؐ کا دیدار نہ کرلوں۔ اور جب میں اپنی اور آپؐ کی موت کا تصور کرتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ آپؐ جنت میں داخل ہونے کے بعد انبیاءؑ کے ساتھ بلند مقام پر ہوں گے‘ میں اگر جنت میں داخل ہو بھی گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپؐ کا دیدار نہ کر پاؤں گا۔ اس پر جبریلؑ سورۃ النساء کی آیت ۶۹ لے کر آئے:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ﴾

’’جو لوگ اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ (جنت میں) ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا‘ پیغمبروں سے اور صدیقوں سے اور شہیدوں اور صالحین سے۔‘‘

پس اس پر وہ صحابی مطمئن ہو گئے۔

حضرت عمر فاروق ؓ زندگی بھر آپؐ کے ساتھ رہے۔ رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو مدینہ میں دفن ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کو حضرت عائشہؓ کے پاس بھیجا تا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں دفن ہونے کے لیے اجازت حاصل کرلیں۔ چنانچہ اُمّ المؤمنین نے

اجازت دے دی اور فاروق اعظم کی یہ خواہش بھی پوری ہوگئی کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد بھی انہیں آپؐ کی رفاقت ملے۔ یہ تھی صحابہ کی آپؐ سے محبت اور رفاقت کی خواہش۔ صحابہ کرام ؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سچی محبت رکھنے والے تھے‘ وہ آپؐ کے جاں نثار تھے۔ اپنی جان مال آپؐ پر نچھاور کرتے تھے۔ ان کی فداکاری کے قصے احادیث میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

جنگ اُحد کے موقع پر حضرت طلحہ ؓ حضور ﷺ کا دفاع کر رہے تھے۔ وہ آپؐ کے سامنے سینہ تانے کھڑے تھے تاکہ جو تیر آئے وہ حضور ﷺ کے سینے کے بجائے ان کے سینے پر لگے۔ آنحضرت ﷺ کا دفاع کرتے ہوئے حضرت طلحہؓ کا ہاتھ شل ہوگیا اور سارا جسم چھلنی ہوگیا۔ ان کے جسم پر تیر وتلوار کے تقریباً ستر زخم تھے۔ ایک دفعہ آپ ﷺ سفر میں تھے اور حضرت ابوقتادہ ؓ آپؐ کا دفاع کر رہے تھے۔ وہ ساری رات آپؐ کی سواری کے ساتھ آپؐ کی حفاظت کی غرض سے چلتے رہے۔ آپؐ نے فرمایا: ’’ابوقتادہ! اللہ کے نبی کی حفاظت کرنے کے صلہ میں اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے۔‘‘

صحابیات بھی دل وجان سے آپؐ پر فدا تھیں۔ صحابہ کی طرح وہ بھی آپ ﷺ کو اپنی جان و مال سے زیادہ عزیز سمجھتی تھیں۔ ایک عورت کا بھائی‘ بیٹا اور شوہر ایک غزوے میں گئے ہوئے تھے۔ خبر اڑ گئی کہ آپؐ شہید ہو گئے۔ وہ عورت دوڑتی ہوئی میدانِ کارزار کی طرف چل پڑی۔ راستے میں ایک مجاہد ملا۔ اس نے خبر دی کہ تیرا شوہر شہید ہو گیا۔ آگے گئی تو خبر ملی کہ بھائی بھی شہید ہو گیا ہے۔ پھر کسی نے اسے بتایا کہ اس کا بیٹا شہید ہو گیا۔ مگر وہ یہی پوچھتی رہی کہ حضور ﷺ کیسے ہیں؟ جب اسے بتایا گیا کہ آپؐ بخیریت ہیں تو اُس نے کلمۂ شکر ادا کیا اور کہا اگر حضور ﷺ حیات ہیں تو ہر نقصان قابل برداشت ہے۔

قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم ہے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے لیے ہمیشہ تیار تھے۔ آپؐ کے ہر حکم کو دل وجان سے قبول کرتے تھے۔ آپؐ کے ادنیٰ اشارے کو ہر شے سے اہم سمجھتے تھے۔ ایک صاحب نے سونے کی انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو پسند نہ کیا۔ انہوں نے وہ انگوٹھی انگلی سے اتار کر پھینک دی۔ جب نشست ختم ہوئی تو کسی دوسرے ساتھی نے کہا کہ اب انگوٹھی اٹھالو‘ کسی اور طرح سے اس سے فائدہ اٹھالینا۔ انہوں نے جواب دیا: جو انگوٹھی رسول اللہ ﷺ نے پھینکی ہو میں اسے کبھی

نہیں اٹھا سکتا۔

ایک صاحب قمیص کا گریبان کھلا رکھتے تھے۔ کسی نے پوچھا گریبان سمیٹتے کیوں نہیں؟ کہنے لگے: جب میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تھا تو آپ ﷺ کا گریبان کھلا تھا' مجھے آپ کی وہ ادا محبوب ہے' اس لیے میں دامن کھلا ہی رکھتا ہوں۔

آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے' کچھ لوگ کھڑے تھے۔ آپؐ نے فرمایا سب لوگ بیٹھ جائیں۔ ایک صاحب مسجد میں داخل ہو رہے تھے' ایک پاؤں دروازے کے اندر دوسرا باہر تھا۔ آپؐ کی آواز سن کر وہیں بیٹھ گئے اور یہ گوارا نہ کیا کہ حضور ﷺ کی آواز سن کر فوراً بیٹھنے کی بجائے ایک قدم آگے بڑھاتے۔

مدینہ میں ہجرت کے بعد آپ ﷺ سولہ سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے' اگرچہ آپ ﷺ کعبہ کی طرف منہ کرنے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ ایک دن آپؐ عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ تحویلِ قبلہ کا حکم آ گیا۔ آپؐ نے رکوع کی حالت ہی میں اپنا رخ کعبہ کی طرف پھیر دیا۔ اور آپؐ کے مقتدیوں نے بھی آپؐ کی پیروی کی اور یہ گوارا نہ کیا کہ نماز ختم ہو جائے تو پھر دریافت کریں گے کہ آپؐ نے حالتِ نماز ہی میں رخ کیوں پھیر لیا؟ پھر جس نے حضور اکرم ﷺ کے اس عمل کی اطلاع پائی' نماز میں ہی اپنا چہرہ بیت اللہ کی طرف پھیر لیا۔

شراب اہلِ مدینہ کا دل پسند مشروب تھا۔ احکم الحاکمین نے بہ یک حکم شراب کو حرام قرار نہ دیا بلکہ تیسرے مرحلے میں اسے قطعاً حرام قرار دے دیا۔ جب یہ حکم صحابہ کرامؓ نے سنا تو ذرا دیر نہ لگائی' اسی وقت شراب چھوڑ دی اور شراب کے برتن انڈیل دیے۔ شراب گلیوں میں بہہ نکلی۔ یہ تھا رسول اللہ ﷺ کے حکم کا احترام۔ کسی نشے کی چیز کو قطعاً چھوڑ دینا انتہائی مشکل ہوتا ہے مگر رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں نشے کو چھوڑنا صحابہؓ کے لیے مشکل نہ رہا۔

ایک دن رسول اللہ ﷺ صحابہ کو نماز پڑھا رہے تھے۔ دورانِ نماز آپؐ نے اپنے جوتے اتارے اور بائیں جانب رکھ دیے۔ جب لوگوں نے دیکھا تو انہوں نے بھی جوتے اتار دیے۔ نماز سے فارغ ہو کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہیں جوتوں کے اتارنے پر کس چیز نے آمادہ کیا؟'' انہوں نے عرض کیا: ''ہم نے آپؐ کو جوتے اتارتے دیکھا تو ہم نے بھی جوتے اتار ڈالے''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس تو جبریل آئے تھے اور بتلایا کہ ان

جوتوں میں گندگی ہے''۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''تم میں سے جب کوئی مسجد میں آئے تو اپنے جوتے دیکھے' اگر ان میں گندگی ہو تو اسے پونچھ کر ان میں نماز ادا کر لے۔ (صحیح سنن ابن داؤد) اس طرح کی ہزاروں مثالیں ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے آپؐ کے عمل کی فوری اتباع کی۔

رسول اللہ ﷺ کا مشن یہ تھا کہ لوگوں کو کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر نورِ توحید کی طرف لائیں۔ غیر اللہ کی بندگی سے ہٹا کر بندوں کو الٰہ واحد کے در پر جھکا دیں۔ اس مشن کی تکمیل کے لیے آپؐ نے پوری زندگی کے شب و روز جِدّ و جُہد کی۔ آپؐ کے جاں نثار صحابہ بھی اس مشن میں دل و جان سے لگ گئے۔ زمانہ آپؐ کا دشمن ہو گیا مگر صحابہ کرامؓ ہر وقت آپؐ کے ساتھ رہے۔ آپؐ کا دفاع کرتے تھے اور اس راہ میں شہادت کو حقیقی کامیابی تصور کرتے تھے۔

صلح حدیبیہ میں جب حضرت عثمانؓ کفارِ مکہ سے بات چیت کرنے کے لیے گئے تو وہاں ان کو دیر لگ گئی۔ افواہ اڑ گئی کہ کفار نے آپؓ کو شہید کر دیا۔ اس پر آپؐ نے فیصلہ کیا کہ اگر یہ بات صحیح ہوئی تو ہم عثمان کے خون کا بدلہ لیں گے۔ چنانچہ تمام صحابہ نے آپؐ کے فیصلے کو تسلیم کیا۔ آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

کوئی بھی معرکہ پیش آتا تو صحابہ کرامؓ کا ایک گروپ آپؐ کے دفاع کی خاطر آپؐ کے اردگرد کھڑا ہو جاتا کہ دشمن کا کوئی وار آپؐ تک نہ پہنچے۔ اس طرح درجنوں صحابہ نے اپنی جانوں کو آپؐ پر قربان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے رومیوں کے خلاف جہاد کی خاطر لشکر تیار کیا اور حضرت اسامہؓ کو قائد مقرر کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی بیماری شدت اختیار کر گئی اور آپؐ کا انتقال ہو گیا اور یہ لشکر روانہ نہ ہو سکا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ ہوئے۔ حالات سنگین ہو گئے۔ مرتدین نے مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ ایسے نازک موقعہ پر بھی خلیفہ اول نے اس لشکر کو روکنا مناسب نہ جانا جسے رسول اللہ ﷺ بھیجنے والے تھے۔ جاں نثار صحابہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کا ساتھ دیا اور ایسے ناموافق حالات میں بھی لشکر کشی کا فیصلہ قبول کیا۔

یتیم نوجوان عبدالعزیٰ نے اپنے سرپرست چچا کی سخت مخالفت کے باوجود اسلام قبول کر لیا اور مدینہ جانے کا ارادہ کیا۔ چچا نے سب کچھ چھین لیا' جسم کے کپڑے اور جوتا بھی اتروا لیا۔ برہنہ نوجوان کو اس کی ماں نے کمبل دیا' اس نے اس کے دو ٹکڑے کر لیے اور سَتر چھپا لیا' پھر مدینہ کا رخ کیا۔ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوئی۔ آپؐ نے اسے اپنے پاس ٹھہرا لیا اور عبداللہ نام رکھا۔ آپ کا لقب ذوالبجادین یعنی ''دو چادروں والا'' تھا۔ ماں کی دی ہوئی چادر

کے دوٹکڑے کر کے اس نے اپنا ستر چھپایا تھا۔ جنگ تبوک کی تیاری ہونے لگی۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے آپؐ سے عرض کی حضور میرے لیے شہادت کی دعا فرمائیں۔ آپؐ نے درخت کا ایک چھلکا عبداللہ کے بازو پر باندھا اور فرمایا: اے اللہ میں عبداللہ کا خون کفار پر حرام کرتا ہوں۔ عبداللہ نے آپؐ کی زبان سے یہ سنا تو حیران رہ گئے' کیونکہ وہ تو شہادت کے طالب تھے۔ آپؐ نے فرمایا: عبداللہ جب تم خدا کی راہ میں نکل پڑے تو پھر اگر بخار سے بھی مرجاؤ تو تم شہید ہو۔ تبوک پہنچے تو عبداللہ کو سچ مچ بخار ہوگیا اور ان کی وفات ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ نے خود انہیں قبر میں اُتارا اور دعا دی۔

حضور اکرم ﷺ کے اشارے پر کٹ مرنا ہر صحابی کی دلی آرزو تھی۔ وہ شہادت پانے کے متمنی تھے۔ وہ یہ برداشت نہیں کرتے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے آپؐ کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جائے۔ آپؐ کے دفاع میں شہید ہونے کو وہ سب سے بڑی کامیابی سمجھتے تھے۔ آپؐ نے ایک لشکر روانہ کیا۔ اگلے دن جمعہ تھا۔ آپؐ نے دیکھا ایک صحابی جس نے لشکر کے ساتھ جانا تھا وہ مسجد میں موجود تھا۔ آپؐ نے اس سے پوچھا: تمہیں تو لشکر کے ساتھ جانا تھا۔ کہنے لگا میں آپؐ کے خطبہ جمعہ میں شریک ہونا چاہتا ہوں' جمعہ کے بعد چلا جاؤں گا۔ آپؐ نے فرمایا: لشکر میں جانا میرا حکم تھا اور میرے حکم سے بڑھ کر کوئی کام نہیں!

صحابہ کرامؓ وہ خوش نصیب تھے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے درمیان موجود تھے۔ وہ آپؐ کو چلتا پھرتا دیکھتے۔ اپنی آنکھوں کے ساتھ محبوب ربّ العالمین ﷺ کا چہرۂ انور کا دیدار کرتے۔ آپؐ کی زبان مبارک سے قرآن کی آیات اور حکمت بھری باتیں اپنے کانوں سے سنتے۔ آپؐ کے ساتھ ہو کر جہاد میں جاتے۔ آپؐ کے دفاع میں کٹ مرنے کو سعادت سمجھتے۔ آپؐ کو مخاطب کرتے تو کہتے: ''میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں''۔ صحابہ کرامؓ کی یہ خوش نصیبی بس ان ہی کا حصہ تھی۔

﴿کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ کے مصداق ایک دن آیا کہ آفتاب رسالت نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ صحابہ کرامؓ نے صبر وتحمل کے ساتھ اس صدمہ کو برداشت کیا۔ وفات سے پہلے آپؐ نے فرمایا: ''تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ بڑے اختلافات دیکھے گا (تو ایسی حالت میں) تم اپنے اوپر لازم کر لینا میرے طریقے اور میرے خلفائے راشدین مہدیین کے طریقے

کی پیروی و پابندی اور مضبوطی سے اس کو تھام لینا اور دانتوں سے پکڑ لینا اور (دین میں) نئی نکالی ہوئی باتوں سے اپنے کو الگ رکھنا' اس لیے کہ دین میں نکالی ہوئی ہر بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے''۔ (مسند احمد' سنن ابی داؤد' جامع ترمذی' سنن ابن ماجہ) نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں' جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے (وہ ہیں) کتاب اللہ اور اس کے رسول کی سنت۔'' (مؤطا امام مالک)

آج حضور ﷺ مسلمانوں کے درمیان بجسدہٖ تو موجود نہیں' مگر ان کی تعلیمات اور فرمودات ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کن کاموں کو کرنے کا حکم دیا ہے اور کن کاموں سے روکا ہے۔ لہٰذا اطاعت رسول میں ہی کامیابی ہے۔ آپؐ کے پسندیدہ کام کرنا اور منکرات سے بچنا ہی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے۔ آج آپؐ کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ مخالفین اسلام کو اعلیٰ علمی سطح پر اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات سے واقف کیا جائے اور خود اُسوۂ حسنہ پر عمل کر کے قرآن وحدیث کی تعلیم کو اختیار کیا جائے۔ آپؐ کی محبت کے اظہار کے لیے نمائشی کاموں سے پرہیز کیا جائے۔ آپؐ کی حقیقی محبت آپؐ کی اطاعت میں ہے' محبت کے بلند بانگ دعووں میں نہیں۔ عمل خلاف سنت ہوں اور اظہارِ محبت کے لیے نمائشی چیزیں اختیار کی جائیں تو یہ دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔ اور اللہ اور اس کے رسول کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔ بات تو عمل سے بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ﴿لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ﴾ فرما کر بتا دیا کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہی بعد والوں کے لیے نمونہ ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط﴾ (المائدۃ:۳) ''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمام کر دی اور دین اسلام کو تمہارے لیے پسند کیا''۔ دین تو مکمل ہو چکا۔ اب اس پر عمل کرنا ہی پسندیدہ ہے۔ اس میں غلو کی اجازت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی محبت میں عجیب وغریب طریقے ایجاد کرنا ہی بدعت ہے۔ مسلمان کو لازم ہے کہ وہ ہر آن اپنے عمل کا جائزہ لیتا رہے کہ اس کا عمل صحابہؓ کے عمل کے مطابق ہو' کیونکہ صحابہ نے اُسوۂ حسنہ کو پوری طرح اپنایا تھا اور جیتے جی رضائے الٰہی کی سند حاصل کر لی تھی۔ ❁❁❁

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا احسانی و عرفانی مقام (۲)

محمد ظفر اقبال

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: اتباعِ شیخ کا مثالی نمونہ

اس مقام پر اگرچہ یہ واقعہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے معمول کی پابندی اور طلبہ کے حق میں شفقت و رعایت کی غرض سے بیان کیا گیا ہے‘ لیکن اگر اس سے متصل ایک اور اہم واقعہ بیان نہ کیا جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی اور منازلِ سلوک و احسان میں شیخ کی اتباعِ کامل کے متعلق شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا اُسوہ پوری طرح نکھر کر سامنے نہیں آسکے گا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ معمول ذکر کیا جا چکا ہے کہ آپ کا جمعرات کے روز چھ گھنٹے پڑھانے کے بعد دیوبند سے گنگوہ پیدل جانے کا معمول تھا۔ ایک دفعہ:

> ”شیخ الہندؒ کے دوست نے جو زمانہ طالب علمی سے دوست تھے اور بعد میں سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی‘ پوچھا کہ او محمود! بتا تو دے‘ گنگوہ میں کیا رکھا ہے جو تو ہر جمعرات کو دوڑا دوڑا جاتا ہے؟ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: ظالم تو نے پی ہی نہیں! اب کے تو بھی چل! وہ ساتھ جانے پر تیار ہو گیا‘ چناں چہ ساتھ لے گئے۔ اتفاق سے ان دنوں شاہ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر عرس ہو رہا تھا۔ حضرت امام ربانی [مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ] کا معمول عرس کے ایام میں ابتداءً تو یہ تھا کہ ان دنوں میں گنگوہ چھوڑ دیتے تھے خانقاہ خالی کر دیا کرتے تھے اور جب معذور ہو گئے تھے تو سفر ترک فرما دیا تھا۔ ہاں! خانقاہ میں نہیں آتے تھے‘ البتہ نماز کے لیے پانچوں وقت تشریف لاتے‘ بلکہ نماز خود ہی پڑھایا کرتے تھے۔ اتنا لحاظ عرس والے بھی کرتے تھے کہ اذان کے وقت سے جماعت ختم ہو جانے اور سنتیں وغیرہ پڑھنے تک قوالی بند کر دیا کرتے تھے۔ ان ایام میں حضرت کے یہاں مہمانوں کی آمد و رفت بالکل بند رہتی تھی‘ کسی سے مصافحہ تک نہیں کرتے تھے۔ غرض حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ رات کے وقت گنگوہ پہنچے اور حضرت کے مکان پر حاضر ہوئے۔ حضرت نے دیکھتے ہی ڈانٹنا شروع

> کر دیا اور فرمایا: ابھی واپس جاؤ۔ آپ [شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ] کے ایک اور بھائی اور دوست تھے: شاہ مظہر حسن گنگوہیؒ‘ مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ محشی ابو داؤد کے بھائی‘ انہوں نے عرض کیا: حضرت! یہ عرس میں شرکت کے لیے نہیں آئے‘ آپ کے پاس آئے ہیں۔ حضرت (گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ) نے ارشاد فرمایا: میں بھی جانتا ہوں عرس میں شرکت کے لیے نہیں آئے‘ میں اتنا بھولا نہیں ہوں‘ میرے پاس آئے ہیں‘ مگر آئے تو ہیں اس مجمع میں ہو کر‘ ان کے ذریعے اس مجمع کی رونق تو بڑھی‘ ((مَنْ كَثَّرَ سَوَادَ قَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ))..... ”جس نے کسی قوم کے افراد میں اضافہ کیا تو وہ ان ہی میں سے ہے“ وارد ہوا ہے‘ قیامت کو اپنی براءت کرتے رہیں۔ اس کے بعد شاہ مظہر حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ان [شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ] کو اپنے مکان پر لے گئے اور کہا روٹی تو کھا لو۔ اس پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے آب دیدہ ہو کر فرمایا کہ: ”حضرت تو فرماویں ابھی چلا جا‘ میں کس منہ سے کھاؤں!“ چنانچہ اسی وقت گنگوہ سے واپس ہو گئے‘ پھر دوسرے وقت عرس ختم ہونے کے بعد حاضر ہوئے۔“(۳۰)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: استاذ نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت‘ ۲۲ میل کا پیدل سفر

جس انسان کا نفس اس درجے مزکّی اور مطہر ہو چکا ہو‘ اس کا قلب اپنے محسنین اور اساتذہ جن سے اسے علم و فضل اور صلاح و تقویٰ بلکہ ایمان میں رسوخ اور عمل میں دوام کی دولت میسر آئی ہو‘ کی محبت سے کس درجے لبریز ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یہ محبت ہی انسان کو محبوب کا خادم اور محبوب کو مخدوم بناتی ہے۔ اس خدمت کا صرف ایک نمونہ دیکھیے! ایک مرتبہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بخار تھا‘ زمانہ برسات کا تھا اور آنا دیوبند تھا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے استاذ نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو گھوڑے پر سوار کیا‘ ایک ہاتھ سے اس کی لگام پکڑی اور ایک ہاتھ سے رکاب کے قریب ہو کر حضرت کی کمر کو سہارا دیا اور اس طرح ۲۲ میل کا راستہ پیدل طے کیا۔(۳۱)

۲۲ میل کا پیدل سفر یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے‘ یہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو استاذ کی محبت نے بے خود کر دیا ہو۔

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد کی اولاد سے بڑھ کر خدمت

چلیے!!! حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تو استاذ تھے‘ اس طرز کی خدمت کی مثالیں ڈھونڈنے سے دیگر باصفا حضرات کے یہاں بھی مل جائیں گی‘ لیکن ایک واقعہ اس سے زیادہ حیران کر دینے

والا ہے جو استاذ نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے نہیں بلکہ ان کے والد محترم سے متعلق ہے۔ مولانا قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ”حضرت نانوتویؒ کے والد شیخ اسد علی مرحوم جب مرضِ وفات میں شدید مبتلا ہوئے تو علاج کے لیے دیوبند لائے گئے‘ قیام شیخ الہندؒ کے مکان پر ہوا‘ دستوں کا مرض تھا...... ایک دفعہ دست چارپائی پر خطا ہوگیا‘ اس وقت حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بھی یہاں موجود نہ تھے‘ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ موجود تھے اور صورت ایسی ہوگئی کہ نجاست اٹھانے کے لیے ظرف (برتن) بھی نہ تھا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بے تکلف ساری نجاست اپنے ہاتھوں اور ہتھیلیوں میں لے لی اور سمیٹنی شروع کر دی‘ تمام ہاتھ گندگی میں آلودہ ہی نہ تھے بلکہ ہاتھوں میں نجاست لبریزی کے ساتھ بھری ہوئی تھی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ پہنچ گئے اور دیکھا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے دونوں ہاتھ نجاست اور مواد سے بھرپور ہیں اور وہ اسے سمیٹ سمیٹ کر بار بار باہر جاتے ہیں اور پھینک پھینک کر آتے ہیں۔ اس پر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بہت متاثر ہوئے اور وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور عرض کیا کہ خداوند! محمود کے ہاتھوں کی لاج رکھ لے اور اس خاص وقت میں جو جو بھی اپنے اس محبوب تلمیذ کے لیے مانگ سکتے تھے‘ ہاتھ اٹھائے ہوئے مانگتے رہے۔“[۳۲]

مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی اولادوں سے خادمانہ برتاؤ کے مظاہر

اس خدمت و محبت اور مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دل سے نکلی ہوئی دعاؤں نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت و رفعت کو ثریا تک پہنچا دیا۔ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے ذہین و ذکی تلامذہ ہوں گے‘ لیکن آج ان کی اکثریت کا نام تاریخ اور ماضی کے دھندلکوں کی نذر ہو چکا اور شیخ الہند کا نام مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایسے جڑا ہوا ہے جیسے رومیؒ کا شمس تبریزؒ کے ساتھ۔ یہ استاذ کی محبت ہی کا اثر ہے کہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین سے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ خادمانہ برتاؤ فرماتے تھے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے حافظ محمد احمد صاحبؒ جو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے‘ کے متعلق شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

> ”حافظ احمد کا میرے دل میں اتنا احترام ہے کہ اگر وہ پاخانے کی ٹوکری اٹھانے کو بھی مجھ سے کہیں تو میں اس کی تعمیل کو اپنی عزت سمجھوں گا۔“[۳۳]

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ‘ حافظ صاحب کے استاذ ہوتے ہوئے بھی ان کے سامنے مؤدب اور

نیازمندانہ بیٹھا کرتے تھے۔ یہ معمول کی بات تھی کہ جب حافظ صاحب شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر تشریف لے جاتے اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ صحن مکان میں چارپائی پر بیٹھے ہوتے‘ دروازے کے سامنے کی سڑک کی لمبی مسافت سے جہاں حافظ صاحب آتے ہوئے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو نظر پڑ جاتے تو حضرتؒ چارپائی چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اس وقت تک کھڑے رہتے تھے جب تک کہ حافظ صاحب مکان میں پہنچ کر اپنی جگہ بیٹھ نہ جائیں اور ان کے بٹھانے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ حضرت شیخ کرسی منگواتے‘ اسے اپنے سرہانے بچھاتے‘ جب حضرت حافظ صاحب اس پر بیٹھ جاتے تب حضرت چارپائی پر بیٹھ جاتے۔[۳۴]

یہ تو براہِ راست مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد کا معاملہ تھا‘ اب مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تیسری نسل یعنی حافظ محمد احمدؒ کے صاحبزادگان مولانا قاری محمد طیب اور مولانا محمد طاہر کے ساتھ رویہ دیکھئے! قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ”جب شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند ورود فرمایا تو حافظ صاحبؒ نے فرمایا کہ: حضرت! ان دونوں بچوں (محمد طیب اور محمد طاہر) کو بیعت فرما لیجیے! تو ازراہِ تفنن فرمایا: لوگ مجھے کہتے ہیں کہ یہ بڑا ہوشیار ہے۔ دو بزرگوں (حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ) کے دو ہی صاحبزادے ہیں (مولانا مسعود احمد گنگوہیؒ اور حافظ احمد صاحبؒ) اس نے دونوں پر پہلے ہی سے قبضہ جما رکھا ہے‘ اب اگر ان بچوں کو بھی بیعت کر لیا تو کہیں گے کہ دیکھو اس نے آگے کو بھی قبضہ رکھنے کو داغ بیل ڈال دی ہے۔ دو دن کے بعد اچانک خود ہی دارالعلوم تشریف لا کر مجھے اور طاہر مرحوم کو بلایا‘ ہمارے ذہن میں بھی نہیں رہا تھا کہ ہمیں بیعت بھی ہونا ہے۔ میں نے عرض کیا: حضرت کیوں یاد فرمایا؟ فرمایا: مرید کرنا ہے۔ اس وقت ندامت سی ہوئی کہ اس کے لیے ہمیں خود حاضر ہونا تھا‘ لیکن یہاں قصہ برعکس ہو رہا ہے۔“[۳۵]

استاذ کی اولاد کی اولاد کے حق اور خدمت کا ایک اور محیر العقول واقعہ دیکھئے جو اپنے تأثر میں اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ جب قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رشتہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء و حکم پر رام پور کے ایک باعزت و دین دار گھرانے میں طے ہوا تو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی امنگ اور جوشِ مسرت سے فرمایا کہ بھائی! یہ رشتہ میں لے کر جاؤں گا۔ چنانچہ یہ پیغام خود ہی لے کر رام پور تشریف لے گئے اور وہاں جا کر فرمایا: ”میں اس وقت حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے گھرانے کے ایک ڈوم اور حجام کی حیثیت سے رشتے کا پیامی بن کر آیا ہوں۔“[۳۶]

میں مولانا نانوتویؒ کے گھر کی خادمہ کا غلام ہوں: شیخ الہندؒ

اسی طرح اپنے برادرِ اصغر مولانا محمد طاہر کے متعلق قاری طیب صاحبؒ ہی راوی ہیں کہ:

''ایک مرتبہ مغرب سے کچھ پہلے کا وقت تھا' نماز کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کی مجلس سے سب لوگ اٹھ کر چلے' میرے برادر خورد مولوی طاہر مرحوم ٹھہر گئے۔ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ اندر زنانہ مکان سے گرم پانی لائے اور مولوی طاہر مرحوم سے فرمایا کہ: وضو کرلو! وہ ذرا ہچکچائے کہ حضرت میرے لیے لوٹا لائے' اس پر فرمایا کہ: تم جانتے بھی ہو کہ میں کون ہوں؟ میں پیرو کا غلام ہوں۔ (پیرو حضرت نانوتویؒ کے گھر میں خادمہ تھیں)۔''(۳۷)

شیخ الہندؒ: بہ صد گریہ مولانا نانوتویؒ کی اہلیہ کے جوتے سر پر رکھنا

پے بہ پے خدمت' عظمت و تعلق اور اس خادمانہ پاس و لحاظ کے باوصف شیخ الہندؒ ہمیشہ اس بات پر نادم اور شرمندہ رہے کہ انہوں نے مولانا نانوتویؒ کے احسانات کا حق ادا نہیں کیا۔ چنانچہ سفرِ حجاز کے لیے روانہ ہوتے وقت مولانا نانوتویؒ کے گھر حاضر ہوئے' مولانا نانوتویؒ کی اہلیہ کی خدمت میں عرض کیا:

''اماں جی! آپ کی کوئی خدمت نہیں کی' بہت شرمندہ ہوں' اب سفر میں جا رہا ہوں' ذرا اپنا جوتا دے دیجیے۔ انہوں نے پس پردہ سے جوتا آگے بڑھا دیا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اس کو لے کر اپنے سر پر رکھا اور روتے رہے کہ میری کوتاہیوں کو معاف فرما دیجیے۔''(۳۸)

مولانا نانوتوی و مولانا گنگوہیؒ کے صاحبزادگان سے اظہارِ عجز و ندامت

چلیے! یہ تو حضرت نانوتویؒ کی اہلیہ تھیں' شیخ الہندؒ کے لیے ماں کے مثل تھیں' ان کے روبہ رو یہ عاجزی اور ندامت قابلِ فہم بھی ہے' لیکن مولانا نانوتویؒ کے صاحبزادے حافظ محمد احمد صاحبؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے صاحبزادے مولانا حکیم مسعودؒ کے بالمقابل بھی شیخ الہندؒ کی عاجزی اور ندامت کا یہی عالم تھا۔ جب کہ حافظ صاحبؒ شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے اور حکیم صاحبؒ مرید۔ مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ سے منقول ہے کہ:

''حضرت شیخ الہندؒ کے مالٹا سے آنے کے بعد حضرت کی مردانہ نشست کے سامنے کے کمرے میں بند کواڑ کھول کر میں اچانک اندر گھسا تو یہ منظر دیکھا کہ دونوں مخدوم زادے ابن قاسم حضرت حافظ محمد احمد صاحب اور ابن رشید حضرت حکیم مسعود احمد صاحب گنگوہی تخت پر ہیں اور حضرت شیخ الہندؒ تخت سے نیچے ان دونوں کے سامنے مؤدب بیٹھے ہیں اور رو رہے ہیں اور ہاتھ جوڑے ہوئے انتہائی نیازمندی سے کہہ رہے ہیں کہ میں نے آپ دونوں کا کوئی حق واجب ادا نہیں کیا' اب میرے مرنے کا وقت ہے اور دونوں بزرگوں (حضرت قاسمؒ اور حضرت گنگوہیؒ) کو منہ دکھانا ہے تو میں انہیں ان کے صاحبزادوں کے بارے میں کیا جواب دوں گا؟ تم دونوں کوئی کلمہ تسلی کا میرے لیے کہہ دو کہ میں وہی کلمہ ان بزرگوں کے سامنے کہہ دوں اور قیامت کے دن یہ بزرگ خود تم سے کچھ پوچھیں تو تم بھی کلمۂ خیر کہنا کہ یہ ناکارہ خادم ہمارا خادم ہی رہا اور ہم سے الگ نہیں ہوا۔''(۳۹)

یہی وہ اوصاف تھے جس نے شیخ الہندؒ کو جاودانی بخشی تھی۔ اپنے شاگرد اور مرید کے روبہ رو ہاتھ جوڑ کر وہی شخص بیٹھ سکتا ہے جو مقامِ احسانی کو پا چکا ہو۔ یہ بے نفسی اور فنائیت عظیم مجاہدات اور سینکڑوں کرامات سے بلند اور بیش قیمت ہے۔

شیخ الہندؒ: جانور سے اُنس

عشق و محبت کے خمیر سے پروان چڑھنے والے ہی معرفت اور احسان کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کے دل میں انسان تو انسان جانور تک کے لیے جذبۂ ترحّم بیدار رہتا ہے۔ مولانا عزیز الرحمٰن بجنوریؒ لکھتے ہیں:

''حضرت شیخ الہندؒ کی عادتِ شریفہ تھی کہ ہر سال قربانی کے لیے بچھڑا خریدا کرتے تھے۔ سال بھر تک اس کی خوب خاطر کرتے اور اپنی اولاد کی طرح رکھتے تھے۔ ایک دفعہ جو بچھڑا خریدا وہ آپ سے بہت زیادہ مانوس ہو گیا۔ حضرت جب دارالحدیث درس دینے کے لیے تشریف لے جاتے تو وہ بچھڑا بھی ہمراہ جاتا اور دارالحدیث کے باہر بیٹھ جاتا۔ جب آپ سبق سے واپس ہوتے تو بچھڑا بھی آپ کے پیچھے پیچھے واپس ہوتا۔ لیکن جب قربانی کا دن آیا تو حضرت شیخ الہندؒ نے تعمیلِ حکمِ خداوندی میں خود اپنے دستِ مبارک سے اس کو ذبح کیا۔ راوی کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت کی یہ حالت تھی کہ ہاتھ سے چھری چلا رہے تھے اور آنکھوں سے اشک ریزاں تھے۔''(۴۰)

اور یہ صرف ایک دفعہ ہی کا واقعہ نہیں ہے' بلکہ مولانا محمود حسن گنگوہیؒ کی تصریح کے

مطابق یہ شیخ الہند رحمہ اللہ کا معمول تھا کہ وہ جانور خود پالتے‘ اسے خود چارہ کھلاتے‘ ایامِ قربانی جب قریب ہو جاتے تو گھاس میں کمی کر دیتے اور بالٹی بھر کر دودھ جلیبی کھلاتے‘ پھر قربانی سے پہلے اس کے جگہ جگہ مہندی لگاتے اور پھر یومِ نحر (۱۰ ذوالحجہ) کو قربان کر کے ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ پر عمل کرتے۔‘‘(۴۱)

وعظ اللہ کے لیے نہ کہ اظہارِ علم کی غرض سے

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ جس زمانے میں جامع العلوم کان پور میں مدرس تھے‘ وہاں جلسہ دستار بندی میں شرکت کی درخواست کے لیے اپنے اساتذہ حضرت شیخ الہند محمود حسن رحمہ اللہ اور مفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ وغیرہ کو دیوبند خط لکھا۔ شیخ الہند رحمہ اللہ کی سادگی کا حال یہ تھا کہ آپ کے پاس صرف ایک کرتا‘ ایک پاجامہ‘ ایک ٹوپی اور ایک لنگی تھی۔ آپ کے کپڑے کھدّر کے ہوتے‘ ہاتھ سے دھوئے جاتے اور انہیں استعمال کیا جاتا۔ چوں کہ کان پور میں دیگر مکتبِ خیال کے علماء اور اہلِ علم سے ملاقات و نشست کا احتمال تھا‘ اس لیے مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے شیخ الہند رحمہ اللہ کو خاص طور پر لکھا:

’’حضرت! میں ایک بات عرض کرتا ہوں‘ ہے تو حماقت جو میں عرض کرتا ہوں‘ مگر بڑے چھوٹوں کی بے وقوفی کو بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ حضرت! آپ ذرا دھلے ہوئے کپڑے پہن کر تشریف لاویں ...... حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے جواب دیا: تمہارے خط کی رعایت کی جائے گی۔‘‘

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے سب لوگوں کو خوش خبری سنائی کہ میرے استاذ شیخ الہند رحمہ اللہ دیوبند سے تشریف لانے والے ہیں‘ جو اتنے کمالات کے جامع ہیں۔ جب ان حضرات کو آمد کی اطلاع پہنچی تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ ان کو لینے کے لیے اسٹیشن گئے‘ شیخ الہند رحمہ اللہ نے اپنے ہاتھ کے دھلے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھے‘ ایک لنگی کندھے پر تھی اور جو کان پور کے علماء تھے وہ بڑے بڑے جبے پہنے ہوئے تھے‘ یہاں ان کو کوئی صورت سے بھی نہیں پہچانتا تھا کہ یہ کوئی چار حرف بھی جانتے ہوں گے۔ مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے وعظ و تقریر کی درخواست کی‘ شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا:

’’میں اور وعظ! کیا تمہاری بھد نہیں ہوگی کہ ایسے کے شاگرد ہیں‘ جن کو بولنا بھی نہیں آتا۔ تمہارا وعظ تو‘ ماشاء اللہ! وعظ ہوتا ہے۔‘‘

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے عرض کیا: نہیں! نہیں! آپ وعظ فرمائیں‘ فرمایا:

’’اچھی بات ہے‘ وعظ کہوں گا‘ تاکہ سامعین کو معلوم ہو جائے کہ شاگرد استاذ سے بڑھا ہوا ہے۔‘‘(۴۲)

وعظ شروع فرمایا‘ جس میں فقہ کے مسائل خوب بیان فرمائے۔ علمائے کان پور یہ سمجھتے تھے کہ دیوبند اور سہارن پور کے علماء معقولات نہیں جانتے‘ فقہ خوب جانتے ہیں۔ اسی اثناء میں مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھیؒ تشریف لے آئے۔ شیخ الہند رحمہ اللہ نفس کشی کے موقع کی تلاش میں رہتے تھے‘ جہاں کوئی ایسا موقع آیا جس سے نفس کو حظ اٹھانے کا موقع ملے یا کوئی ایسی بات ہو جس سے اپنی بڑائی یا عظمت جھلکتی ہو شیخ الہند رحمہ اللہ اسی وقت نفس کشی کا سامان مہیا کر لیتے تھے‘ ان کی ذات وقتی تأثرات و جذبات سے بالکل غیر متأثر اور لاتعلق ہو چکی تھی۔ مولانا لطف اللہ رحمہ اللہ کی آمد اور شیخ الہند رحمہ اللہ کی للّٰہیت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے مولانا تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

’’جناب مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی رحمہ اللہ بھی کان پور تشریف لائے ہوئے تھے‘ میرے عرض کرنے پر جلسے میں تشریف لائے اور عین اثنائے وعظ میں تشریف لائے۔ اس وقت ایک بڑا عالی مضمون بیان ہو رہا تھا جس میں معقول کا ایک خاص رنگ تھا۔ ہم لوگ خوش ہوئے کہ ہمارے اکابر کی نسبت معقولات میں مہارت کم ہونے کا شبہ آج جاتا رہے گا اور سب دیکھ لیں گے کہ معقول کس کو کہتے ہیں۔ مولاناؒ کی جوں ہی مولانا علی گڑھی رحمہ اللہ پر نظر پڑی فوراً وعظ بیچ ہی میں سے قطع کر کے بیٹھ گئے۔ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رحمہ اللہ بہ وجہ ہم درس ہونے کے بے تکلّف تھے‘ انہوں نے دوسرے وقت عرض کیا کہ یہ کیا کیا؟ یہی تو وقت تھا بیان کا۔ فرمایا: ہاں! یہی خیال مجھ کو آیا تھا‘ اس لیے قطع کر دیا کہ یہ تو اظہارِ علم کے لیے بیان ہوا‘ نہ کہ اللہ کے واسطے۔‘‘(۴۳)

ترجمۂ قرآن کی اشاعت کے لیے تلامذہ کی تصدیق‘ بے مثل عاجزی

مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ تو پھر معاصر‘ ذی علم اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے‘ ان کے روبہ رو تواضع کا اختیار کرنا اتنا حیران کن نہیں جتنا اپنے تلامذہ کے سامنے تواضع کا واقعتی اظہار موجبِ حیرت معلوم ہوتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے منقول ہے:

’’جب حضرتؒ نے قرآن پاک کا ترجمہ پورا کیا‘ تو حضرتؒ نے دیوبند میں سب علماء کو جمع کر کے —— جو حضرت کے خدام اور تلامذہ تھے —— یہ فرمایا کہ: بھائی! میں نے

قرآن شریف کا ترجمہ پورا تو کر دیا ہے‘ لیکن سب مل کر اس کو دیکھ لو‘ اگر پسند ہو تو شائع کرو ورنہ رہنے دیا جائے۔‘‘(۴۴)

بلاشک بےنفسی‘ للّٰہیت اور تقویٰ کا یہ مقام عارفین کو بھی بہت آخر میں جا کر نصیب ہوتا ہے اور اس کا حصول انسان کو ہر ہر لحظہ اپنے احتساب اور محاسبے میں مشغول اور متوجہ رکھتا ہے۔

شیخ الہندؒ: انگریزوں کے متعلق استفتا کا جواب لکھنے سے اعراض‘ نفرت کلیدی وجہ

ایسے متقی اور باصفا انسان کا کوئی کام جذبات یا غصے سے مغلوب ہونے کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ انگریز جس سے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نفرت میں بہت بڑھے ہوئے تھے‘ تحریکِ خلافت کے دوران جب ترکِ موالات کے بارے میں حضرتؒ سے استفتا کیا گیا تو اپنے محبوب ترین شاگردوں (مولانا سید حسین مدنی‘ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مفتی کفایت اللہ رحمہم اللہ) کو بلا کر فرمایا:

’’بھائی! یہ استفتا آیا ہے‘ میں چاہتا ہوں اس کا جواب آپ لکھ دیں‘ کیوں کہ حکمِ خداوندی یہ ہے کہ: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ (اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل و انصاف کے خلاف کچھ کہو‘ عدل کرو کہ وہی تقویٰ کے قریب تر ہے) اور مجھے انگریزوں سے جس درجے عداوت و بغض ہے اس کے ہوتے ہوئے مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے‘ کہیں میں ان کے بارے میں خلافِ انصاف کوئی بات نہ لکھ جاؤں۔‘‘(۴۵)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: تکفیرِ مسلم سے احتراز کا نمونہ

جو انسان اپنے بدترین دشمن کے متعلق حکم لگانے میں اس درجے محتاط ہو وہ حلقۂ یاراں کے لیے کیوں ریشم کی طرح نرم نہ ہوگا۔ اسی احتیاط کی ایک مثال دیکھیے! مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین میں کسی صاحب نے اہل بدعت کی تردید میں ایک رسالہ لکھا‘ اہلِ بدعت نے اس کا جوڑ دلکھا‘ اس میں انہیں کافر قرار دیا‘ اس عمل کے جواب میں ان صاحب نے دو شعر کہے:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغِ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دروغے را جزا باشد دروغے

’’تم نے مجھے کافر کہا‘ مجھے اس کا غم نہیں‘ کیوں کہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا‘ میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہوں گا‘ کیوں کہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہوسکتی ہے۔‘‘

انہوں نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو یہ شعر سنائے تو آپؒ نے شعر کی لطافت کی تعریف فرمائی‘ لیکن ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ تم نے لطافت کے ساتھ ہی سہی کافر تو کہہ دیا‘ حالاں کہ فتوے کی رو سے وہ کافر نہیں ہیں‘ اس لیے ان اشعار میں اس طرح ترمیم کرلو:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغِ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
وہم شکر بجائے تلخ دوغے
اگر تو مومنی فبہا والّا
دروغے را جزا باشد دروغے(۴۶)

’’تم نے مجھے کافر کہا‘ مجھے اس کا غم نہیں‘ کیوں کہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا‘ میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہوں گا اور تلخی کا جواب شیرینی سے دوں گا۔ اگر تم واقعی مومن ہو تو خیر‘ ورنہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہوسکتی ہے۔‘‘

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے فیضانِ کرم سے کفار تک بہرہ ور تھے

مخلوق کی بلاتفریق مذہب وملت اور بلاتخصیص نسل و نسب محبت‘ اخلاقِ صوفیہ میں داخل ہے۔ اخلاقِ صوفیہ فی الاصل مشکوٰۃِ نبوت ہی سے ماخوذ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں حاضر باش رہنے والوں میں تربیت کے متعلق فرمایا گیا:

أفضلهم عندهٗ أعمهم نصيحةً، وأعظمهم عندهٗ منزلةً، أحسنهم مواساةً ومؤازرةً (۴۷)

’’رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں افضل وہ مانا جاتا تھا جس کی خیرخواہی عام ہوا کرتی تھی‘ اور آپ ﷺ کے یہاں مرتبے کے لحاظ سے سب سے عظیم اور بڑھا ہوا وہ ہوتا تھا جو ہمدردئ خلق اور لوگوں کی ذمے داریوں کا بار برداشت کرنے میں سب سے بہتر ہوتا تھا۔‘‘

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ان ہی اوصاف سے موصوف تھے۔ ان کی آغوشِ شفقت مسلمان تو

مسلمان‘ کفار تک کے لیے کھلی ہوئی تھی۔ مولانا محمود رام پوری ؒ بیان کرتے ہیں کہ:

’’ایک مرتبہ میں اور میرے ساتھ ایک ہندو ایک مقدمے کے سلسلے میں دیوبند آئے‘ دیوبند پہنچ کر اس ہندو نے مجھ سے پوچھا: تم کہاں ٹھہرو گے؟ میں نے کہا: میں مولانا [محمود حسن ؒ] کے یہاں قیام کروں گا۔ وہ ہندو بولا کہ جی میں روٹی تو اپنے اقارب میں کھالوں گا‘ باقی سونے کے واسطے اگر کوئی چھوٹی سی چارپائی مجھ کو مل جائے تو وہاں ہی ٹھہر جاؤں گا۔ میں نے کہا: مل جائے گی‘ تو روٹی کھا کر آ جانا۔ ایسا ہی ہوا‘ میں نے حضرت مولانا [محمود حسن ؒ] کی بیٹھک میں ایک چارپائی اس کے لیے الگ بچھادی۔ ایک چارپائی پر [میں] لیٹ گیا‘ وہ ہندو تو پڑتے ہی سوگیا اور میں جاگ رہا تھا کہ حضرت مولانا دبے پیروں زنانہ مکان سے تشریف لائے اور اس ہندو کی چارپائی کی پٹی پر بیٹھ کر اس کے پیر دبانے لگے۔ میں ایک دم چارپائی سے کھڑا ہوگیا اور جا کر عرض کیا: حضرت! چھوڑ دیں‘ میں دبا دوں گا۔ فرمایا کہ: یہ تمہارا حق نہیں‘ میرا مہمان ہے‘ یہ خدمت میرے ذمے ہے۔ میں نے اصرار کیا‘ اس پر فرمایا کہ: جاؤ! تم کون ہوتے ہو؟ گڑبڑ مت کرو‘ بے چارے کی آنکھ کھل جائے گی۔ بس وہ ہندو تو پڑا ہوا خرخر کر رہا تھا اور مزاحاً فرمایا کہ ان کا مقدر تھا اور مولانا پاؤں دبا رہے تھے۔‘‘(۴۸)

شیخ الہند ؒ کے ان واقعات کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ حقوق جو انسان پر قانوناً فرض نہیں ہیں‘ شیخ الہند ؒ نے اُنہیں باطن کے تصفیے اور روحِ تصوف کی تکمیل کے لیے خود پر اخلاقاً فرض کرلیا تھا۔ یہی عارفین سلف اور صوفیائے کاملین کا مابہ الامتیاز ہے جس کی عملی سیرت سنت کی اصطلاح میں ’’خُلق‘‘ ہے۔

اشدضرورت پر باطنی کمالات وتصرفات کا اظہار

ایسے عرفانی اوصاف اور احسانی کمالات کے حامل انسانوں کے قلب ولسان کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمہ وقت قبولیت ومقبولیت کا درجہ ومرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ یہی وہ حضرات ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی بات کو خالی نہیں لوٹاتے‘ وہ خود کو خواہ کتنے ہی پردوں میں چھپائیں‘ لیکن اللہ تعالیٰ ان کے حسنات اور کمالات کو عالم پر آشکارا کرکے ہی رہتا ہے۔ شیخ الہند ؒ کی زندگی کے واقعات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی قبولیت ومقبولیت کے اسی مقام پر فائز تھے:

’’مولوی کفایت اللہ صاحب سابق مدرس مدرسہ اسلامیہ میرٹھ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی ؒ سے بیعت تھے اور گنگوہ میں پرورش پائی تھی۔ مولانا [محمود

حسنؒ] جس زمانے میں مالٹا میں تھے‘ ان [مولوی کفایت اللہ] پر اثنائے ذکر وشغل میں ایک کیفیت پیدا ہوئی کہ خودکشی کی رغبت ہوئی تھی‘ مگر نہ کرسکے اور اس وجہ سے ایسے ضیق میں مبتلا تھے کہ مرجانا بہتر سمجھتے تھے‘ انہوں نے حضرت کی خدمت میں خط لکھا اور مدد چاہی۔ حضرت نے حسبِ عادت انکسار کا جواب لکھا جس میں یہ فقرے بھی تھے کہ ’’حیرانم کہ بچہ دہقان را بچہ کار سپرانند‘‘ مجھے ایسے کام کے لیے اہل کیوں سمجھ لیا وغیرہ وغیرہ...... [آخر وہ حضرت (محمود حسنؒ) سے ملنے کے لیے حاضر ہوئے] حضرت نے محبت سے پاس بٹھایا اور جب حاضرین چلے گئے تو ان کی طرف خطاب فرمایا کہ: تم نے کیا لکھا تھا؟ مجھے تعجب ہوا کہ جانتے بوجھتے تم ایسی بات لکھتے ہو! بھلا میں اس کا اہل کہاں؟ مولوی کفایت اللہ صاحب نے جرأت سے کام لیا اور کہا کہ: حضرت! اگر کوئی کہے کہ آپ اہل نہیں تو یہ آپ پر نہیں بلکہ حضرت گنگوہی ؒ پر اعتراض ہے کہ انہوں نے آپ کو خلیفہ کیوں بنایا؟ آپ یقیناً اہل ہیں اور حضرت گنگوہی ؒ کے خلیفہ ہیں‘ چونکہ میں نے اسی دروازے پر تربیت پائی ہے جہاں سے آپ کو سب کچھ ملا ہے‘ اس لیے میرا فرض تھا کہ اپنا دکھ درد عرض کردوں۔ اس پر حضرت نے سکوت فرمایا اور پھر پوچھا کہ: اب کیا حالت ہے؟ عرض کیا کہ: کچھ نہیں۔ بعد عشاء بہ کمالِ شفقت حال سنا اور ذکر دوازدہ تسبیح میں کچھ ترمیم فرما کر ارشاد فرمایا کہ: حضرت گنگوہی ؒ کے یہاں ایک شخص کو یہی حالت پیش آئی تھی تو حضرت نے بھی یہی بتایا تھا جو میں نے بتایا ہے۔ یہ کہیں کہ کسی طرح اس مصیبت سے نجات مل جائے کہ درس تدریس میں لگیں‘ چھوڑا اس ذکر وشغل کو جس میں جان سے عاجز ہوگیا اور حضرت اصرار فرماویں کہ گھبراؤ مت‘ ذکر وشغل جاری رکھو‘ اور کرتے رہو جو کر رہے ہو۔ یہاں تک کہ جب مکان تشریف لے جانے لگے تو فرمایا کہ: کتب خانے کے سامنے والے کمرے میں پچھلی رات کو بیٹھ کر اتنے زور سے بارہ تسبیح کرنا کہ میرے گھر تک آواز جائے اور پھر صبح کو نماز فجر کے بعد ارشاد ہوا کہ یہاں حجرے سے باہر مراقب ہو کر بیٹھ جاؤ۔ مولانا لکھتے ہیں کہ: اس وقت کی کیفیت ذکر میں نہیں آسکتی کہ اندر بیٹھے کیا کر رہے تھے‘ پھر مجھے اپنا قلب زخمی نظر آتا تھا جیسے اس میں پیپ پڑگئی ہے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ حضرت اس کو اپنے دست مبارک سے صاف فرما رہے ہیں۔ بعض دفعہ میں چونک پڑتا اور پھر مراقب ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔ بعد اشراق حضرت حجرے سے باہر تشریف لائے اور درس کے لیے تشریف لے چلے تو مجھے ساتھ لیا اور بخاری شریف کا سبق ہونے لگا۔ سبق میں

مجھے وہ کیفیت نظر آئی کہ پھر نصیب ہونا مشکل ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ حضرت تقریر کو طول دیں اور اس کے لیے حضرت کو چھیڑنے کی ضرورت تھی‘ لہٰذا میں نے اُلٹے سیدھے سوالات شروع کر دیے‘ پھر کیا تھا گویا سمندر میں تلاطم آ گیا۔ حضرت نے ایک ایک سوال کے کئی کئی جوابات دینا شروع کیے اور بعض دفعہ یہ بھی فرمایا کہ اس جواب کو کتابوں میں تلاش مت کرنا‘ یہ جواب کتابی نہیں۔ بعض دفعہ میں اشکال پیش کرتا تو اس کا جواب دے کر فرماتے کہ یہاں ایک دوسرا اشکال اور ہے جس سے شراح نے تعرض نہیں کیا اور اس کے بعد وہ اشکال مع جواب خود ارشاد فرماتے۔ غرض وہ حال جاتا رہا اور طبیعت میں سکون پیدا ہو گیا تو میں نے عرض کیا کہ میں نے ٹکٹ تھانہ بھون کا لیا تھا‘ فرمایا کہ اچھا جاؤ‘ مگر واپسی میں کم از کم یہاں کے واسطے رکھنا کہ ابھی خامی باقی ہے۔ چنانچہ واپسی بجائے ایک دن کے دو دن حضرت کے پاس قیام کیا اور جو خامی مجھے محسوس نہ ہوتی تھی وہ محسوس ہونے لگی کہ جب نماز فجر کے بعد حضرت کے حجرے کے باہر مراقب ہو کر بیٹھتا تو معلوم ہوتا کہ قلب میں کوئی چیز بھری جا رہی ہے جس سے دل میں سکون وقوت اور راحت معلوم ہوتی۔ غرض اول حاضری میں زخم قلب کو آلائش سے پاک صاف فرمایا اور دوسری میں زخموں کو مندمل کیا اور آئندہ مرہم پٹی سے مستغنی اور بے نیاز بنا دیا۔ اللہ جزائے خیر دے حضرت کو‘ میری ایسی دست گیری فرمائی کہ جس کا شکریہ تمام عمر ادا نہیں ہو سکتا۔“(۴۹)

شیخ الہند ؒ کی کرامت: بابِ ایمان میں شکوک کا یقین واطمینان میں تبدّل

مولانا سید مناظر احسن گیلانی ؒ نے اپنے دیو بند کے زمانۂ طالب علمی میں خود اپنی آپ بیتی کے تحت ایک لرزا دینے والا عبرت آموز واقعہ بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دورۂ حدیث کے سال میں نہ جانے کیوں مولانا گیلانیؒ ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے متعلق‘ نعوذ باللہ! بہت سے شبہات اور بدگمانیوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ شبہات اور بدگمانیاں مولانا گیلانی ؒ کی تصریح کے مطابق دن بہ دن بڑھ رہی تھیں: ”گویا بدگمانیوں کی ایک آگ تھی جو معلوم ہوتا تھا کہ میرے باطن میں بھڑک اٹھی ہے۔ دو گھنٹے عموماً ترمذی شریف کا درس مسلسل جاری رہتا اور ایک سیاہ کار‘ سیاہ سینہ ان دو گھنٹوں کے اندر ان ہی شکوک وشبہات کی آتشیں لہروں میں جلتا بھنتا رہتا‘ ہر حدیث میرے لیے بدگمانی اور سوئے ظن کا چقماق گویا بنتی چلی گئی۔ دماغ صرف ہرزہ اندیشوں اور یاوہ بافیوں کا کارخانہ بنا ہوا تھا۔“ الغرض مولانا

گیلانیؒ کی ایمانی کیفیت دن بہ دن ایسے روبہ زوال تھی کہ ”محسوس ہو رہا تھا کہ دین کی مرکزی چٹان ہی سے پاؤں‘ العیاذ باللہ! پھسل رہا ہے“ کہ اچانک قدرت نے دست گیری فرمائی۔ مولانا گیلانی‘ دیو بند کے اُمّی رکن حضرت امیر شاہ صاحب مینڈھوؒ کی معرفت اپنے درد کے مداوا اور ایمان کی سلامتی کی غرض سے شیخ الہند ؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے‘ حضرت امیر شاہؒ نے تعارف کراتے ہوئے کہا: آپ کے شاگرد ہیں‘ کچھ عرض کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ مولانا گیلانیؒ نے خلوت میں اپنے دل کا دکھڑا نہایت ہی رقت آمیز اور درد انگیز کیفیت سے بیان کیا‘ یہ سن کر شیخ الہند ؒ نے فرمایا: ”مولوی صاحب! آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ اپنا یہ حال جب آپ کے لیے اتنا ناگوار ہے‘ تو یہ بے ایمانی کی نہیں ایمان کی دلیل ہے‘ ایمان نہ ہوتا تو ان حالات میں اتنا پریشان ہی کیوں ہوتے؟“

مولانا گیلانی ؒ لکھتے ہیں: ”بعد کو یہ مضمون خود نبوت کے ارشادات میں بھی ملا‘ لیکن پہلی دفعہ حضرت شیخ الہند ؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ اس طرح نکلے کہ دل میں معلوم ہوتا تھا کہ کچھ تھا ہی نہیں‘ طمانیت اور بشاشت کی لہریں میرے چہرے پر کھلنے لگیں۔ یہ دیکھ کر تب ارشاد ہوا: ”آپ نے کہاں کہاں اور کیا کیا پڑھا ہے؟“ اپنی تعلیمی روداد سنائی گئی‘ زیادہ وقت قدیم فلسفہ اور منطق کے پڑھنے میں صرف ہوا ہے۔ یہ معلوم کر کے فرمانے لگے: ”جو کچھ آپ کچا پکا نگلتے چلے گئے ہیں‘ اب وہ سب کچھ باہر نکل رہا ہے‘ پریشان ہونے کی بات نہیں ہے“۔ شاید بے اختیار گریے کے ساتھ عرض رسا ہوا کہ حضرت! میرے لیے خواہ کچھ بھی ہو‘ اب یہ حالت ناقابلِ برداشت ہے۔ میرے لیے اس قسم کے وساوس واوہام کسی حیثیت سے بھی ہوں ناقابلِ تحمل ہیں‘ میری زندگی خطرے میں ہے‘ اب خواہ دنیا مانے یا نہ مانے‘ لیکن اپنے ذاتی تجربے کا میں کیا کروں؟ جواب میں فرمایا گیا: ”مولوی صاحب! جاؤ اب کوئی شبہ اور کسی قسم کا شک تم کو نہ ہوگا“۔ یہ یا اسی کے ہم معنی الفاظ تھے۔ آج سے تقریباً ۴۰ سال پہلے اللہ کے ایک برگزیدہ دوست کی مبارک زبان سے یہ بات نکلی۔ خاکسار‘ اس کا دماغ‘ اس کا دل‘ اس کی زندہ شہادت ہے کہ اس طویل عرصے میں‘ بحمد اللہ! پھر کسی قرآنی آیت‘ یا کسی نص نبوی میں کسی قسم کا شبہ اب تک تو پیدا نہیں ہوا..... گویا کوئی کیل ٹھونک دی گئی ہے۔“(۵۰)

شیخ الہند ؒ کی پشتی بانی: اَخلاف کے لیے ایقان کا مینارۂ نور

علامہ انور شاہ کشمیری ؒ کا بے نظیر حافظہ واستحضار‘ بے مثل علمی تبحر‘ رسوخ کامل اور

وسعت نظر اپنوں ہی نہیں پرایوں میں بھی مسلم ہے۔ شاہ صاحبؒ تو خیر آفتاب علم تھے‘ ان کے درس وتقریر سے ایسے باکمال افراد ہندوستان کے مطلع پر ضیاء بار ہوئے جن کی نظیر ممکن نہیں۔ غور فرمایا جائے کہ کیا حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ علم و مرتبہ اور طلبہ کے لیے درسی ایقان کا منبع ہونا صرف حضرت شاہ صاحبؒ کی اکتسابی اور ذاتی باطنی کیفیت کا مظہر تھا یا اس کے پیچھے کسی ولیٔ کامل کی پشتی بانی بھی کارفرما تھی؟ جس وقت شیخ الہند ؒ سفر پر روانہ ہونے لگے جس میں اسیر مالٹا ہو کر جانے کی نوبت آئی‘ اس وقت:

> ’’علامہ انور شاہ صاحب ؒ باوجود یہ کہ ترمذی کا سبق پڑھانے کے لیے آ کر بیٹھ گئے تھے‘ عبارت بھی پڑھ دی گئی تھی۔ [مولانا انور شاہؒ نے] مفارقتِ حضرت [شیخ الہندؒ] کے غم میں کچھ نہ فرمایا‘ بلکہ ذرا دیر توقف فرما کر کتاب بند کر دی اور حضرت [شیخ الہندؒ] کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت اس وقت چار پائی پر پیر لٹکائے بیٹھے تھے۔ شاہ صاحب ؒ نہایت خاموشی سے جا کر بیٹھ گئے اور حضرت [شیخ الہندؒ] کی دونوں پنڈلیوں کو پکڑ کر سینے سے چمٹا لیا۔ شیخ الہند ؒ نے بھی تکلف سے کام نہ لیا‘ یوں ہی رہنے دیا‘ فرمایا: ’’شاہ صاحب! آپ کو میری موجودگی میں شبہات پیش آتے تھے‘ میں نہ رہوں گا تو شبہات پیش نہ آئیں گے‘ اور اگر آئیں بھی تو قدرت رہ نمائی کرے گی۔ جاؤ! خدا کے سپرد! سبق پڑھاؤ۔‘‘(۵۱)

شیخ الہند ؒ کے اس روحانی تصرف اور پشتی بانی سے مولانا انور شاہ ؒ کو خود تو کیا شبہات پیدا ہوتے‘ وہ دوسروں کے لیے شبہات کے ازالے اور تصفیے کا تریاق بن گئے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی ؒ نے شاہ صاحب ؒ کی درسی تقریر کے کمالات اور اثرات کے ذیل میں اپنے پہلے ہی دن کے تأثرات کو ایک جملے میں یوں سمو دیا ہے:

> ’’[شاہ صاحبؒ کی تقریر کا] پہلا دن تھا‘ جس میں قرآن کے بعد دین کا سارا بنیادی نظام میرے لیے قطعی و یقینی ہو گیا۔‘‘(۵۲)

اس اطمینان و ایقان کی گواہی شاہ صاحب ؒ کے متعلقین‘ تلامذہ اور احباب سب ہی نے دی ہے۔

متذکرہ واقعات تو لوگوں کو گمراہی سے ہدایت کی طرف واپس لانے سے متعلق تھے۔ ایک واقعہ ایسا بھی ملاحظہ کیجیے جس میں ایک گستاخ کو اس کے انجام بد سے ڈراتے ہوئے توبہ کی تلقین کی گئی تھی‘ لیکن اس نے اپنی گستاخی سے خود پر ہدایت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر لیا اور ایمان سے محروم ہو گیا۔

شیخ الہند ؒ کی تنبیہہ: احمد احسن امروہوی کا انجامِ بد

مولانا محمد حسین بٹالوی اپنے عہد میں ردِ تقلید اور حمایت اہلِ حدیث کی ایک ’’پرشور‘‘ آواز تھے‘ انہوں نے برعظیم کے تمام اہل سنت و جماعت احناف کو ایسے دس مسائل کا انتخاب کر کے چیلنج دیا کہ اگر احناف اِن مسائل کے اثبات میں کوئی آیت‘ یا کوئی حدیث صحیح صریح قطعی الدلالۃ پیش کر دیں تو مولانا بٹالوی فی آیت اور فی حدیث دس روپے انعام دیں گے۔ گویا مولانا بٹالوی کے زعم میں ان دس مسائل میں اہل سنت کے پاس کتاب و سنت سے کوئی دلیل موجود نہیں تھی۔ اس چیلنج کے باعث ایک طرف جہاں علمائے احناف کی تحقیر و تذلیل ہوئی وہیں دوسری جانب امام اعظم ابو حنیفہ ؒ کی تجہیل بھی لازم آئی۔ ظاہر ہے یہ تعلّی مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ اور مولانا محمود حسن ؒ کو سخت ناگوار ہوئی‘ شیخ الہند ؒ نے مولانا نانوتوی ؒ کی اجازت و اشارے سے اس اشتہار کا جواب ’’ادلۂ کاملہ‘‘ کے نام سے دیا۔ شیخ الہند ؒ منتظر رہے کہ مولانا بٹالوی اس کے جواب میں قلم اٹھائیں۔ مولانا بٹالوی نے تو اس کا جواب نہیں دیا‘ بالآخر جواب دہی کے لیے ایک ایسے صاحب کا انتخاب ہوا جو اپنی زبان کی تیزی اور قلم کی کاٹ میں طاق ہونے کے باعث حلقہ اہل حدیث میں ’’احسن المناظرین والمتکلمین‘‘ کے لقب سے جانے جاتے تھے‘ ان کا نام محمد احسن امروہوی تھا۔ امروہوی موصوف نے ’’ادلۂ کاملہ‘‘ کا جواب ’’مصباح الادلہ لدفع الادلة الذلہ‘‘ کے نام سے لکھا۔ مولانا بٹالوی نے خود جواب لکھنے سے پہلو تہی فرماتے ہوئے امروہوی صاحب کی کتاب کو ’’لاجواب اور جواب باصواب‘‘ قرار دیا۔ شیخ الہند ؒ نے اس اعلان کے بعد ’’مصباح الادلۃ‘‘ کا جواب ’’ایضاح الادلۂ‘‘ کے نام سے تحریر فرمایا جس میں جابجا محمد احسن امرہوی کی لسانی گستاخیوں اور قلمی بے احتیاطیوں پر تنبیہہ فرمائی۔ شیخ الہند ؒ لکھتے ہیں:

> ’’[مصنف مصباح الادلہ] بعض مواقع میں اپنے جوش میں بے باکانہ کلماتِ تکفیر بول اُٹھے ہیں۔‘‘(۵۳)

ایک مقام پر امروہوی صاحب کی گستاخیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’مجتہد صاحب ماشاء اللہ مسلم ہیں‘ گو بدفہم اور متعصب و کج طبع اور ہر چند عباد صالحین و علمائے دین کی شان میں گستاخ اور مقلد طریقۂ رفاض ہیں اور اگرچہ تکفیر مومنین میں معتزلہ و خوارج کے شاگرد ہیں اور یہ امور گو یقیناً سخت خوف ناک ہیں اور سبب خذلان

وہلاکت......''(۵۴)

شیخ الہند ؒ نے جب یہ الفاظ تحریر فرمائے ہوں گے‘ اس وقت ان کے حاشیۂ گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ وہ کوئی پیشین گوئی فرما رہے ہیں۔ آپ کا مقصد امروہوی صاحب کو اکابر کی شان میں گستاخیوں پر تنبیہ اور اس کے خوفناک انجام سے ڈرانا تھا‘ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ امروہوی صاحب کے متعلق شیخ الہند ؒ کے اشارہ کردہ جملے ''باعث خذلان و ہلاکت'' پورے ہوئے۔ امروہوی صاحب غیر مقلدیت سے ترقی کر کے مرزا قادیانی کے حلقہ ارتداد میں داخل ہوگئے۔ اندازہ کیجیے! وہ شخص جس کے نزدیک امام اعظم ابوحنیفہ ؒ کی ذات گرامی لائق تقلید نہیں تھی وہ مرزا غلام احمد قادیانی جیسے کاذب پر ایمان لا کر اس کی اقتدا کرنے لگا۔ مرتد ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی بھی نمونۂ عبرت بن گئی‘ امروہوی صاحب مرزائیوں کی بھیک اور خیرات کے دست نگر ہوگئے۔ مرزا قادیانی کے مجموعہ اشتہارات نمبر: ۸۷ پر درج ہے:

''اس وقت ضروری طور پر اپنے دوستوں کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ اخویم مکرم حضرت مولوی سید محمد احسن صاحب جو اس وقت مقام بھوپال محلّہ چوبدار پورہ میں نوکری سے علیحدہ ہو کر خانہ نشین ہو گئے ہیں‘ بوجہ تکالیف عسر ہمدردی کے لائق ہیں..... لہٰذا ہر ایک بھائی کی اپنے اپنے مقدرت کے موافق توجہ درکار ہے۔''(۵۵)

اس کے بعد مرزا قادیانی نے ان بائیس افراد کی فہرست دی ہے جنہوں نے مرتد احمد احسن امروہوی کو دو آنے سے پانچ روپے ماہوار خیرات دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ان میں سے ایک نے دو آنے کا‘ دس آنے کا‘ چار آنے کا‘ دو نے آٹھ آنے کا‘ پانچ نے ایک روپے کا‘ تین نے دو روپے کا اور ایک نے پانچ روپے کا وعدہ کیا۔ یہ کل ۲۹ روپے دو آنے کی رقم ہوئی جس کا ۲۲ افراد نے وعدہ کیا۔ اور مرزا غلام قادیانی نے ''ھل من مزید'' کی غرض سے اشتہار جاری کیا۔ مرزا جو ''رئیس قادیان'' کہلاتا تھا خود اپنے پلّے سے سو پچاس روپے بہ آسانی بھجوا سکتا تھا‘ ورنہ اپنے دو تین مال دار مریدوں کو کہہ کر احمد احسن امروہوی کی کفالت کا ذمے دار ٹھہرا سکتا تھا‘ لیکن اتنی ارزاں اور حقیر سی بات کے لیے باقاعدہ اشتہار کے اجراء سے فی الاصل قدرت کو مرزا کی خست اور احمد احسن کی ذلت کا اشتہار دلوانا مقصود تھا۔ یہ تھا وہ انجامِ بد جس کی طرف شیخ الہند ؒ نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا: ''باعث خذلان و ہلاکت''۔ بالفاظ دیگر ائمہ ہدیٰ

کی شان میں گستاخیوں کا یہی وہ انجام تھا‘ جس کی طرف شیخ الہند ؒ نے ''سبب خذلان و ہلاکت'' کہہ کر تنبیہ فرمائی تھی۔

خلاصۂ کلام

واقعات و نقول کی فہرست بہت طویل ہے‘ بہ طور خلاصہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ شیخ الہند ؒ کو اللہ تعالیٰ نے ہر اعتبار سے بڑا بنایا تھا۔ اگر ایک طرف شیخ الہند ؒ اپنے علم و فضل کے اعتبار سے محدث جلیل‘ تالیف و تصنیف کے پہلو سے ادیب اریب‘ سیاست و جہاد کے لحاظ سے مجاہد عظیم‘ اذکار و عبادات کے رخ سے صوفی باصفا نظر آتے تھے تو دوسری طرف بندگانِ خدا پر شفقت‘ بے نفسی و فنائیت‘ فروتنی و عاجزی‘ دنیا سے نہایت استغنا کے ساتھ ایک گونا تعلق‘ اکرام ضیف‘ اساتذہ و شیوخ ہی نہیں‘ ان کی اولاد‘ بلکہ اولاد کی اولاد کے ساتھ بھی اساتذہ کی نسبت سے احترام و تعلق کے معاملے‘ اور طالبان علوم پر شفقت و رافت ایسے عصرِ حاضر میں عنقا اوصاف و کمالات ہیں جس نے شیخ الہند ؒ کو اپنے عہد میں ''عباد الرحمٰن'' کا مظہر کامل بنا دیا تھا۔ شیخ الہند ؒ کی اس جامعیت و کاملیت کو آپ کے مقتدا مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ نے آپ کے متعلق ایک ہی جملے میں سمو کر بیان کر دیا ہے:

''طریقِ سلوک میں اصل مقصود احسان ہے‘ سو بفضلہٖ تعالیٰ حاصل ہے۔''(۵۶)

احسان و عرفان کی یہی وہ کیفیت تھی کہ شیخ الہند ؒ نے علم و عمل کا جامع بن کر تا زندگی انسانی حیات کے مختلف گوشوں کو معمور و منور کیا‘ اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ دو بحورِ علم و احسان نے مل کر شیخ الہند ؒ کو تیار کیا تھا۔ اور پھر شیخ الہند ؒ نے ''کارخانۂ علوم'' بن کر ہندوستان کو علم و فضل‘ وعظ و ارشاد‘ افتاء و تصنیف‘ دعوت و جہاد اور مناظرے و مکالمے کے لیے بے مثل اور لافانی رجال کار عطا کیے۔ آپؒ کی تربیت و تاثیر سے ہر فرد‘ فرق مراتب کے باوصف‘ اپنے وقت کا ''شیخ الہند'' بنا۔ بالفاظِ دیگر شیخ الہند ؒ کے تلامذہ اور مسترشدین میں جس کو جس فن سے مناسبت اور اہلیت تھی ''نسبت محمودی'' اس کے ظرف کے مطابق اس میں ضرور منتقل ہوئی۔ یہ نسبت و تعلق ایسا ہی ہے جیسا سورج کا اس کی کرنوں سے ہوتا ہے۔ سورج کی ہر ہر کرن اپنی تابانی میں آفتاب ہی کا فیض ہوتی ہے۔ آفتاب ان تمام شعاعوں سے ماورا ہونے کے باوجود اپنی کرنوں سے مربوط اور متعلق بھی رہتا ہے۔ شیخ الہند ؒ کے چیدہ چیدہ اوصاف و کمالات کا فیض ان کے اخلاف و

تلامذہ میں ان کے اپنے اپنے پیمانے اور ظرف کے مطابق منتقل ہوا' لیکن ان مختلف النوع اور متنوع بلکہ متضاد و متبائن اوصاف کی جامع شخصیت ایک ہی رہی: شیخ الہند محمود حسن رحمہ اللہ۔

در پسِ آئنہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

''کارکنانِ قضا وقدر نے مجھے طوطی کی طرح آئینے کے پیچھے بٹھا رکھا ہے۔ جو کچھ بھی معلم ازل کہتا ہے میں وہی بولتا ہوں۔''

حوالہ جات

(۳۰) محمود حسن گنگوہیؒ: ملفوظات فقیہ الامت' جلد:۱' صفحات:۱۰۶-۱۰۷' قسط اوّل۔
(۳۱) عزیز الرحمٰن بجنوریؒ: تذکرہ مشائخ دیوبند' بجنور' زرین کتب خانہ' ۱۹۵۸ء' صفحہ:۲۰۲۔
(۳۲) قاری محمد طیبؒ: پچاس مثالی شخصیات' مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام' جلد:۷' صفحات:۴۲۶-۴۲۷۔
(۳۳) ایضاً' صفحہ:۴۳۹۔ (۳۴) ایضاً' صفحہ:۴۳۹-۴۴۰۔
(۳۵) ایضاً' صفحہ:۴۲۱-۴۲۲۔ (۳۶) ایضاً' صفحہ:۴۲۶۔
(۳۷) محمد زکریا سہارن پوریؒ: آپ بیتی' صفحہ:۹۵۴۔
(۳۸) ایضاً۔
(۳۹) قاری محمد طیبؒ: پچاس مثالی شخصیات' مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام' جلد:۷' صفحہ:۴۴۰۔
(۴۰) عزیز الرحمٰن بجنوریؒ: تذکرۂ شیخ الہندؒ' صفحات:۱۶۸-۱۶۹۔
(۴۱) محمود حسن گنگوہیؒ: ملفوظات فقیہ الامت' جلد:۱' صفحات:۱۰۵-۱۰۶' قسط:۴۔
(۴۲) محمود حسن گنگوہیؒ: ملفوظات فقیہ الامت' جلد:۱' صفحات:۴۲-۴۳' قسط:۵۔
(۴۳) اشرف علی تھانویؒ: ذکر محمودؒ' مشمولہ تذکرہ شیخ الہندؒ' صفحہ:۵۳۰۔
(۴۴) محمد زکریا سہارن پوریؒ: آپ بیتی' جلد:۲' صفحہ:۹۵۰۔
(۴۵) قاری محمد طیبؒ: پچاس مثالی شخصیات' مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام' جلد:۷' صفحات:۴۲۷-۴۲۸۔
(۴۶) محمد تقی عثمانی: اکابر دیوبند کیا تھے؟' کراچی: ادارۃ المعارف' ۲۰۰۳ء' صفحہ:۲۳۔
(۴۷) محمد بن عیسیٰ الترمذیؒ: الشمائل المحمدیۃ' بیروت: دار الحدیث' ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء' باب ما جاء فی تواضع رسول اللہ ﷺ' صفحہ:۱۶۲۔

(۴۸) اشرف علی تھانویؒ: ملفوظات حکیم الامتؒ' جلد:۲' صفحات:۲۰۶-۲۰۷' ملفوظ:۲۸۵۔
(۴۹) محمد زکریا سہارن پوریؒ: آپ بیتی' جلد:۲' صفحات:۱۰۰۶-1008۔
(۵۰) مناظر احسن گیلانیؒ: احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن' کراچی: مکتبہ عمر فاروق' ۲۰۱۱ء' صفحات:۱۰۸-۱۱۲۔
(۵۱) محمود حسن گنگوہیؒ: ملفوظات فقیہ الامت' جلد:۱' صفحات:۱۰۸-۱۰۹۔
(۵۲) مناظر احسن گیلانیؒ: احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن' صفحہ:۶۱۔
(۵۳) محمود حسنؒ: ایضاح الادلہ' دیوبند: مطبع قاسمی' [س-ن] صفحہ:۵۔
(۵۴) ایضاً' صفحہ:۳۹۳۔
(۵۵) مرزا غلام احمد قادیانی: مجموعہ اشتہارات' ربوہ: الشرکۃ الاسلامیۃ' [س-ن]' جلد:۱' صفحہ:۳۳۷۔
(۵۶) قاری محمد طیبؒ: پچاس مثالی شخصیات' مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام' جلد:۷' صفحات:۴۲۹۔

❁❁❁

بقیہ: گناہ کی حقیقت اور توبہ کی اہمیت

نیز انتقام کی آگ اور جذبات نہ بھڑکتے رہیں۔ یہی حکمت نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان میں ہے' جس کے راوی سیدنا عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ ہیں اور جسے جدید دور کے محدث علامہ ناصر الدین البانیؒ اپنے مجموعہ احادیث صحیحہ کی جلد سوم میں لائے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْعَمَدُ قَوَدٌ وَالْخَطَأُ دِيَةٌ)) یعنی جان بوجھ کر قتل کرنے کا کفارہ قصاص ہے' اور قتل خطا کا بدلہ دیت (خون بہا) ہے۔ البتہ جان کا بدلہ جان دینے میں قاتل پاک صاف ہو کر دنیا سے جائے گا — اسی طرح وراثت کا مال کھا جانے والے یا جائیداد پر قبضہ کر لینے والے بھی عنداللہ توبہ کریں اور ورثاء کا حق ادا کریں' مثلاً بہنوں' بیٹیوں اور دیگر وارث عورتوں کو ان کا حق ادا کر دے' وگرنہ بحوالہ سورۃ النساء' آیت ۱۱۴ اور آیت ۹۳ دائمی سزائے جہنم کا اندیشہ ہے — اگر اپنی زبان اور قلم کو اسلام کے خلاف یا بدعات اور فسق و فجور کے کام میں لایا تھا تو اب زبان و قلم کو اسلام کی نشر و اشاعت میں لگا دے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے' ہمیں کثرت سے استغفار کرنے کی توفیق دے اور ثابت قدمی سے صراطِ مستقیم پر چلا دے۔ آمین!

❁❁❁

Aug 2017
Vol.66

Regd. CPL No.115
No.8

Monthly **Meesaq** Lahore

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
کے زیر اہتمام

داخلے جاری ہیں

(پارٹ I اور II)

رجوع الی القرآن کورسز

جاری کردہ **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

یہ کورسز بنیادی طور پر تعلیم یافتہ افراد کے لیے ترتیب دیے گئے ہیں' تاکہ وہ حضرات جو کم از کم انٹرمیڈیٹ کی سطح تک اپنی دنیاوی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور اب بنیادی دینی تعلیم بالخصوص عربی زبان سیکھ کر فہم قرآن کے حصول کے خواہش مند ہوں' ان کورسز کے ذریعے ان کو ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر دی جائے۔ ہفتے میں پانچ دن روزانہ صبح کے اوقات میں تقریباً پانچ گھنٹے تدریس ہوگی۔ ہفتہ وار تعطیل ہفتہ اور اتوار کو ہوگی۔

نصاب (پارٹ I) برائے مرد و خواتین

1. عربی صرف ونحو
2. ترجمہ قرآن
3. آیاتِ قرآنی کی صرفی ونحوی تحلیل
4. قرآن حکیم کی فکری وعملی راہنمائی
5. تجوید و ناظرہ
6. مطالعۂ حدیث و فقہ العبادات
7. اصطلاحاتِ حدیث
8. اضافی محاضرات

نصاب (پارٹ II) صرف مرد حضرات

1. مکمل ترجمۃ القرآن (مع تفسیری توضیحات)
2. مجموعۂ حدیث
3. فقہ
4. اصولِ تفسیر
5. اصولِ حدیث
6. اصولِ فقہ
7. عقیدہ
8. عربی زبان و ادب
9. اضافی محاضرات

- اس سال کلاسز کا آغاز 31 جولائی سے ہوگا
- داخلہ کے خواہشمند خواتین و حضرات 31 جولائی کو صبح 8:30 بجے انٹرویو کے لیے قرآن اکیڈمی تشریف لائیں
- پارٹ II میں خواتین کی شرکت کا انتظام نہیں ہے

نوٹ: داخلہ کے خواہشمند 31 جولائی تک اپنی رجسٹریشن ضرور کروالیں۔ رجسٹریشن نہ ہونے کی صورت میں لیٹ داخلہ نہیں دیا جائے گا۔

پارٹ I میں داخلے کے لیے انٹرمیڈیٹ پاس ہونا اور پارٹ II میں داخلے کے لیے رجوع الی القرآن کورس (پارٹ I) پاس کرنا لازمی ہے

برائے رابطہ: **قرآن اکیڈمی**
36-K ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: 3-35869501
email:irts@tanzeem. org

ندیم سہیل
0322-4371473